غل دستہ

ڈاکٹر محمد یونس بٹ

۲۰۰۲ء

- مسلح افواج کے سربراہ

پیر پگاڑا تو فرماتے ہیں جماعت اسلامی دراصل مسلم لیگ ہی کا اردو ترجمہ ہے۔ بہرحال یہ فرق ہے کہ جماعت میں ایک امیر ہوتا ہے اور مسلم لیگ میں سبھی ہوتے ہیں۔ جماعت کے امیروں میں نمبر ایک مولانا مودودی ہیں۔ میاں طفیل محمد دو نمبر امیر تھے اور قاضی حسین احمد تیسرے درجے کے ہیں۔ قاضی حسین احمد اور میاں طفیل محمد صاحب کے مزاج میں وہی فرق ہے جو اسلامی جمعیت طلبہ اور جماعت اسلامی میں ہے۔ مولانا مودودی تو چھڑی ہاتھ میں یوں پکڑتے تھے جیسے قلم پکڑا ہو۔ میاں صاحب کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ قلم پکڑا ہے یا چھڑی جبکہ قاضی حسین احمد تو قلم بھی یوں پکڑتے ہیں جیسے چھڑی پکڑی ہو۔ ہر امیر کے دور میں جماعت کی رفتار وہی رہی جو امیر کے اپنے چلنے کی تھی۔ میاں صاحب تو ایسے ہیں کہ جب تک بندہ رک نہ جائے' پتہ نہیں چلتا وہ چل رہے ہیں۔ قاضی صاحب رکے بھی ہوں تو ہم سے تیز ہوتے ہیں۔ لگتا ہے وہ زمین کے اوپر نہیں چلتے' زمین ان کے نیچے چلتی ہے۔

میاں طفیل محمد صاحب اس عمر میں ہیں جس میں کسی بندے کو یہ خوشخبری دی جا سکتی ہے کہ آپ کی زندگی میں کوئی جنگ نہ ہو گی۔ وہ امارت میں ہی دوسرے نمبر پر نہیں آئے۔ بچپن میں کسی لڑکے سے لڑائی ہو جاتی تو اس میں بھی دوسرے نمبر پر ہی آتے۔ پہلے پٹھان کوٹ اور پینٹ کوٹ بھاتا تھا۔ ٹائی لگاتے پھر ایسی داڑھی رکھی کہ ٹائی لگاتے تو ناٹ' ناٹ ویزایبل ہوتی۔ پتلون بھی پہنتے تھے' مگر بعد میں پہننا چھوڑ دی

کہ پتلون سینے کے گرد ٹائٹ لگتی تھی۔ دوران گفتگو پنجابی کے لفظ یوں استعمال کرتے ہیں جیسے سیاست دان عوام کو استعمال کرتے ہیں۔ تقریر کر رہے ہوں تو وہ اردو بول رہے ہوتے ہیں اور لوگ پنجابی سن رہے ہوتے ہیں۔ ہر کام اصلاح کے لیے کرتے ہیں۔ حضرت داتا گنج بخش کی کتاب "کشف المحجوب" کا ترجمہ کیا۔ کہتے ہیں، نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ اصلاح بھی کر دی۔

لاطینی کہاوت ہے، پینٹر اور وکیل بہت جلد سیاہ کو سفید کر دیتے ہیں، مگر یہ ایسے وکیل تھے کہ ان کے موکل کے مخالفوں کو وکیل کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ یاد رہے ان دنوں وکیل کئے جاتے تھے، آج کل تو بعض اوقات جج ہی کر لیے جاتے ہیں۔ چارلس ڈکنز سے کسی نے پوچھا۔ "اچھا وکیل بننے کے لیے کیا چاہیے؟"

اس نے کہا۔ "برے لوگ"

سو میاں صاحب اچھا وکیل نہ بن سکے۔ یوسفی لکھتے ہیں۔ "وکیل وکالت چھوڑ دے اور سچ بولنے لگے پھر بھی لوگ اسے وکیل ہی کہتے ہیں۔" لیکن میاں صاحب جب وکالت کرتے تھے تب بھی لوگ انہیں میاں ہی کہتے تھے۔ پھر "بار" کو یوں چھوڑا جیسے ڈاکٹر کے کہنے پر Cirrohotic "بار" جانا چھوڑتے ہیں۔ کہتے ہیں وہ بے اختیار سچ بول دیتے ہیں حالانکہ وہ بااختیار سچ بولتے ہیں۔ آپ کی بات اس قدر توجہ سے سنیں گے کہ آپ کا بات ختم کرنے کو دل نہ چاہے گا۔ طبیعت میں اس قدر عاجزی کہ بندہ عاجز آ جاتا ہے۔ وہ جتنے بھولے ہیں، اتنا بھولا ہونے کے لیے بڑا کچھ بھولنا پڑتا ہے۔ جماعت کی بہتری کے لیے انھوں نے جو کام کئے، ان میں سے ایک جماعت کی امارت سے معذرت کرنا ہے۔ گھر کا ماحول ایسا کہ ان کے بچوں سے پوچھو۔ "کس جماعت میں پڑھ رہے ہو؟" تو کہیں گے۔ "جماعت اسلامی میں" بڑی سے بڑی تکلیف پر بھی آپ ان سے ہمدردی کرنے جائیں تو آپ کو یوں تسلیاں دے رہے ہوں گے جیسے انہیں آپ کے ساتھ ہمدردی ہے۔

تھامس فلر کا کہنا ہے۔ "آج کل سچ سب سے بڑی خبر ہے۔" اور میاں صاحب بڑی

خبرناک شخصیت ہیں۔ جمہوریت پر ہمیں یہ اعتراض ہے کہ جمہوریت آتی ہے۔ مارشل لاء میں یہ خوبی ہے کہ وہ آتا ہے' آتی نہیں اور میاں صاحب عورت کی حکمرانی کے قائل نہیں۔ بڑی سے بڑی کامیابی پر بھی خدا سے دعا مانگتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں۔ "اللہ میاں اس بار معاف کر دو' آئندہ ایسا نہ ہو گا۔" لہجہ ایسا نرم کہ اگر کسی رند سے غصے میں پوچھیں کہ تم شراب پیتے ہو؟ تو اسے سمجھ نہ آئے گی کہ سوال پوچھ رہے ہیں یا دعوت دے رہے ہیں۔ جس کی بے عزتی کریں' اسے ہی پتہ ہوتا ہے کہ میری بے عزتی کر رہے ہیں' دوسرے سمجھتے ہیں کہ عزت کر رہے ہیں۔ انہیں کسی بات پر کم ہی غصہ آتا ہے اور جب غصہ آتا ہے تو کم ہی پتہ چلتا ہے کہ کس بات پر آیا۔ ایسے ٹھنڈے کہ گرمیوں میں بھی ان کے پاس چادر لے کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ وہ کام بھی اچھے طریقے سے کرتے ہیں جو کام صرف طریقے سے کئے جاتے ہیں۔ پہلے رس گلے چینی میں ڈبو کر کھاتے' اب چینی بھی دھو کر کھاتے ہیں۔ وہ غلط وقت پر صحیح بات کرتے ہیں لیکن صحیح وقت پر غلط بات نہیں کرتے۔ البتہ وہ کسی کو اسلامی ذہن کا بندہ کہیں تو اس سے مراد جماعت اسلامی ذہن کا بندہ ہو گا۔

مولانا مودودی جماعت کو سیاست میں لائے' قاضی حسین احمد سیاست کو جماعت میں لائے۔ سیاست میں ان کی سوچ الگ ہے۔ سوچ الگ نہ ہو تو خود الگ ہو جاتے ہیں۔ قاضی صاحب وہ وکیل ہیں جو عدالت میں کیس یوں لڑتے ہیں جیسے عدالت پر مقدمہ چلا رہے ہوں۔ شروع ہی سے اس قدر تیز تھے کہ سکول میں ان کی جو تاریخ پیدائش درج ہے' اس سے دو سال قبل پیدا بھی ہو چکے تھے۔ ان کے بزرگ کام کے قاضی تھے۔ "زیارت کاکا" گاؤں میں ان کا خاندان گاؤں کا استاد تھا۔ ان کے سامنے سب "کاکے" تھے۔ ان کے گھر کے ارد گرد دوسروں کے گھر یوں ہی تھے جیسے دیہاتی سکول کے بچے استاد کے ارد گرد بیٹھے ہوتے ہیں۔ تعلق اس خاندان سے جہاں نوجوانوں کے چہرے پر داڑھی نہ ہونا بے پردگی میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں جماعت کے نظم میں ضبط ہوئے۔ وہ اسلامی جمعیت طلبہ سے جماعت میں نہ آئے بلکہ اسلامی جمعیت طلبہ ان سے جماعت میں

آئی۔

بچپن ہی سے جغرافیہ سے اس قدر لگاؤ تھا کہ کوئی پوچھتا' بتاؤ فلاں فلاں ملک کہاں ہے تو جھٹ بتا دیتے۔ "جغرافیہ کی کتاب کے فلاں صفحے پر" بچپن میں دنیا کا نقشہ یوں دیکھتے جیسے اپنا ناک نقشہ دیکھ رہے ہوں۔ پھر جغرافیہ کے استاد ہوئے اور جغرافیہ کے استاد کے لیے جغرافیہ سے اہم کوئی مضمون نہیں ہوتا کیونکہ جغرافیہ کے نہ ہونے سے ہمیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا' مگر وہ استاد نہیں رہ سکتا۔ نوجوانی میں مشتاق احمد یوسفی صاحب کو بھی جغرافیے کا اتنا شوق تھا کہ ایک صاحب انہیں اداکارہ مسرت نذیر کی ہسٹری بتا رہے تھے تو یوسفی صاحب نے کہا۔ "قبلہ ہسٹری کو چھوڑیں مجھے ان کا جغرافیہ بتائیں۔"

خواتین کے معاملے میں قاضی صاحب کا رویہ اتنا سخت نہیں جتنا مولانا عبدالستار نیازی صاحب کا ہے کہ انہوں نے تو عورت سے شادی تک نہیں کی۔ بہرحال قاضی صاحب سے مس گائیڈڈ میزائل کا پوچھیں تو کہیں گے۔ "وہ میزائل جسے کسی مس نے گائیڈ کیا ہو۔"

قاضی صاحب کا نشانہ اچھا ہے۔ ایک بار نشانہ بازی کر رہے تھے' ٹارگٹ پر جو تصویر تھی کوئی نشانہ اسے نہ لگا تو احباب نے فوراً وہاں سے وہ تصویر ہٹا کر ولی خان اور الطاف حسین کی تصویر رکھی تو نشانہ خود تیر پر آ لگا۔ رحمت الٰہی صاحب کا جماعت کا عہدہ چھوڑنا ان کے لیے رحمت الٰہی بنا۔ قاضی وہ تھے ہی' یوں میاں طفیل محمد صاحب کے طفیل جماعت کے میاں بھی بن گئے۔

قاضی صاحب اپنے اور جاوید اقبال کے والد سے متاثر ہیں۔ نرگس پسند ہے اور کرگس ناپسند۔ گرمی اور سردا بہت کھاتے ہیں۔ دوسروں کو سننے کا اس قدر شوق ہے کہ منظر بھی وہ پسند ہے جس میں کچھ سننے کو ہو' جیسے پرندوں کی چہچہاہٹ اور پانی کا شور۔ دیکھنے میں اپنے قد سے لمبے لگتے ہیں۔ سنتے ہوئے سر بلند اور کہتے ہوئے سر بلند رکھتے ہیں۔ پٹھان ہیں اور آپ کو پتہ ہے پٹھان کب پٹھان کی طرح ہوتا ہے؟ جی ہاں' جب غصے میں ہوتا ہے۔ وہ تو تقریر کر رہے ہوں تو لگتا ہے غصہ کر رہے ہیں۔ آپ پوچھیں گے' غصے میں کیا کرتے ہیں تو جناب غصے میں صرف غصہ کرتے ہیں۔ غصے میں ہوں

تو سرخ رنگ ان کے چہرے کی طرح ہو جاتا ہے۔ کرنٹ افیرز پر بات کر رہے ہوں تو بات میں اور کچھ ہو نہ ہو' کرنٹ ضرور ہوتا ہے۔ ہم زمانہ طالب علمی میں اونچی

آواز میں بول بول کر سبق یاد کیا کرتے تھے' وہ اس طرح سوچتے ہیں۔ تقریروں میں اقبال کے شعر اس قدر استعمال کرتے ہیں کہ لگتا ہے یوم اقبال پر تقریر فرما رہے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں وہ پردے کے بڑے حق میں ہیں' حالانکہ انہیں ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں مخالفین کو ننگا کرتے ہم نے خود دیکھا ہے۔ خود کو بے قرار رکھتے ہیں۔ ان کے ذمے کوئی کام لگایا جائے تو اسے یوں کرتے ہیں جیسے کام ان کے ذمے نہیں لگایا گیا' وہ کام کے ذمے لگائے گئے ہیں۔ اس قدر متحرک کہ ایک جگہ بیٹھے ہوئے بھی ساکن نہیں ہوتے۔ وہ آرام کر رہے ہوں تو یقین کر لیں' یہ سب اپنی مرضی سے نہیں ڈاکٹر کی مرضی سے کر رہے ہوں گے۔ رات گئے دن کا آغاز کرتے ہیں اور اس وقت تک پہلا دن ختم نہیں کرتے جب تک اگلا شروع نہ کر لیں۔

پٹھان اپنی زبان نہیں بدلتے لیکن وہ ایرانیوں سے فارسی' عربوں سے عربی' اہل مغرب سے انگریزی' اہل خانہ سے پشتو' ہم وطنوں سے اردو' اور ہم جماعتیوں سے اسی زبان میں بات کرتے ہیں جو وہ سمجھتے ہیں۔ انہیں بولنا تو کئی زبانوں میں آتا ہے مگر چپ رہنا کسی زبان میں نہیں آتا۔ سر ڈھانپنا ان کے نزدیک ستر ڈھانپنا بلکہ بہتر ڈھانپنا ہے۔ لوگوں کے سر پر بال اگتے ہیں' ان کے سر پر ٹوپیاں۔ ان کے نزدیک تو ٹنڈ کرانا سر سے ٹوپی اتارنا ہوتا ہے۔ باریش چہرے پر مسکراہٹ کھلتی رہتی ہے۔ اگرچہ کھیلنے کے لیے مسکراہٹ کے پاس کم ہی چہرہ بچا ہے۔ لہجہ ایسا کہ جنرل دوستم کو بھی جنرل دو ستم کہتے ہیں۔ قاضی حسین احمد مخالفوں کے لیے قاضی بھی ہیں اور حسین بھی۔ انہوں نے ذاتی عدالتیں بھی لگوائیں۔ "پاسبان" کی ان عدالتوں میں ان کی موجودگی ایسے ہی ضروری ہوتی ہے جیسے پنجابی فلم ہٹ کرانے کے لیے سلطان راہی۔ اسی لیے وہ پاسبان کے جلسے میں جا رہے ہوتے ہیں تو لگتا ہے "شوٹنگ" پر جا رہے ہیں۔ مجاہد آدمی ہیں' کار سے بھی یوں

نکلتے ہیں جیسے مورچے سے نکل رہے ہوں۔ ہاتھ ملا رہے ہوں تو لگتا ہے ہتھ جوڑی کر رہے ہوں۔ چلتے یوں ہیں جیسے پیش قدمی کر رہے ہوں۔ بلا شبہ وہ پاکستان کی مصلیٰ افواج کے سربراہ ہیں۔

• پان کا بادشاہ

اگرچہ وہ پان کی چلتی پھرتی پبلسٹی کمپین ہیں' لیکن اتنی شہرت انہوں نے پان کو نہیں دی جتنی پان نے انہیں دی ہے۔ ویسے تو پان کے ذکر کے بغیر ہمارا بھی حدود اربعہ بیان کرنا دشوار ہے کہ ہم بڑے دھان پان ہیں' لیکن مولانا دھن پان شخصیت ہیں۔ وہ جے یو پی کے تاحیات صدر ہیں یعنی جب تک جے یو پی حیات ہے۔ بول رہے ہوں تو جے یو پی کے کم اور یو پی کے زیادہ لگتے ہیں۔ وہ نام کے ہی شاہ نہیں' کام اور پان کے بھی شاہ ہیں۔ میرٹھ میں پیدا ہوئے مگر پوچھو کہاں پیدا ہوئے تو کہیں گے "گھر میں"

بچپن میں فٹ بال کے کھلاڑی تھے۔ فٹ بال اور سیاست میں یہ قدر مشترک ہے کہ اگر فٹ بال گول میں گرانا ممکن نہ ہو تو مخالف کھلاڑی کو گرانے کی کوشش کریں۔

مولانا صاحب میں شروع ہی سے سیاست دان بننے والی خوبیاں موجود تھیں۔ کوچ نے ایک بار کہا کہ اگر فٹ بال نہ چھین سکو تو مخالف کھلاڑی کو ٹانگ مار کر گرانے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد کہا' ابھی فٹ بال آتا ہے تو کھیل شروع کرتے ہیں۔ اس پر مولانا نے کہا فٹ بال کو چھوڑیں آپ کھیل شروع کروائیں۔ سیاست میں فٹ بال ایم کیو ایم والے لے گئے کیونکہ الطاف حسین حالی تو پانی پت میں پیدا ہوئے تھے مگر ایم کیو ایم کے الطاف حسین بے حالی پانی پت کے میدان میں پیدا ہوئے۔

ہر وقت ان کے منہ میں پان اور جماعت اسلامی ہوتی ہے۔ دوران گفتگو بات کرتے کرتے جماعت اسلامی پر فقرہ یوں پھینکتے ہیں جیسے پان کھاتے کھاتے پیک پھینکتے ہیں۔ اب تو جماعت اور پاندان کے بغیر کہیں جاتے بھی نہیں۔ گلوری گلے میں یوں دباتے ہیں جیسے کلرک فائل دباتے ہیں۔ منہ ایسا کہ اس میں پان نہ ہو تب بھی لگتا ہے کہ ہے۔ ہمیں تو پان کھانے کا سلیقہ ہی نہیں آتا۔ یوں شرم سے پان پان ہوتے رہتے ہیں۔

مولانا کو اقوام متحدہ پر محبت آئے تو اسے قوام متحدہ کہیں گے۔ پان اس قدر نفاست سے کھاتے ہیں کہ کیا مجال منہ سے پتہ چلے کہ پان کھا رہے ہیں' قمیض سے پتہ چلتا ہے۔ پانوں کے بعد ان کی دوسری مصروفیات جماعت اسلامی ہے۔ سال میں چند دنوں کے لیے وہ پاکستان کے تبلیغی دورے پر آتے ہیں۔ مذہبی رہنما انہیں سیاست دان سمجھتے ہیں اور سیاست دان انہیں مذہبی رہنما مانتے ہیں۔ ان کے والد محترم کو قائداعظم نے بیرونی ملک کے دورے پر بھیجا تا کہ باہر پاکستان کی فضا بہتر بنائیں۔ اب مولانا خود دوروں پر چلے جاتے تا کہ پاکستان کی فضا بہتر رہے۔ جب تک وہ باہر رہتے ہیں' بہتر رہتی ہے۔

انہیں دنیا کی ہر اہم زبان آتی ہے جو نہیں آتی اسے اہم نہیں سمجھتے۔ فرانسیسی' فارسی' اردو' انگریزی اور سواحلی اس قدر روانی سے بولتے ہیں کہ سننے والے کو بہا لے جاتے ہیں۔ ویسے فرانسیسی تو ہم بھی سمجھ لیتے ہیں بشرطیکہ اردو میں بولی جائے۔ عربی پسند ہے۔ گلا تک عربی سے صاف کرتے ہیں۔ اردو تک یوں بولتے ہیں کہ ایک صاحب خربوزے بیچ رہے تھے۔ ان سے پوچھا۔ "آپ عدداً بیچتے ہیں یا وزناً؟" تو دکاندار نے کہا۔ "مولانا! میں خربوزے بیچتا ہوں۔" بڑے بدلہ سنج اور بذلہ سنج ہیں۔ بھٹو مرحوم نے ایک بار کہا۔ "آپ ایک شریف آدمی کی بات پر اعتبار کریں اور میری بات مان لیں۔" تو مولانا بولے۔ "آپ ایک شریف آدمی لے آئیں' میں اعتبار کر لوں گا۔" فرماتے ہیں۔ "جس سے ناراض ہوتا ہوں اسے ایک منٹ میں نکال دیتا ہوں۔ دل سے بھی اور پارٹی سے بھی۔" ان کی پارٹی اتنی ہی بڑی ہے جتنا بڑا ان کا دل ہے۔ وہ دین کو سیاست سے الگ رکھتے ہیں جیسے ذوالفقار علی بھٹو سے حزب اختلاف کی لڑائی میں۔ وقت نماز وہ اپنی جماعت کی الگ جماعت کراتے ہیں اور سیاست میں مفتی محمود کی امامت میں لڑتے ہیں۔ ان کی جماعت ملک کی چھوٹی پارٹیوں میں سب سے بڑی پارٹی ہے' لیکن وہ پارٹیاں جو اس سے بہت بڑی ہیں' یہ ان سے تھوڑی ہی چھوٹی ہے۔ البتہ الیکشن کے دنوں میں جب دوسری پارٹیوں کے سربراہ اپنے ووٹ تلاش کر رہے ہوتے ہیں' یہ اپنے امیدوار تلاش

کرتے ہیں۔ دوسری پارٹیوں کا منشور ہی ان کا مسلک ہوتا ہے۔ ان کا مسلک ہی ان کا منشور ہوتا ہے۔

ایک تاجر سے ہم نے پوچھا کہ مولانا کے سیاست میں آنے سے کیا فرق پڑا ہے؟ تو اس نے کہا۔ "سرمہ نورانی اور پان نورانی زیادہ بکنے لگا ہے۔" مولانا کے مداح ان کے نام کے ساتھ اتنے القاب و آداب لگا دیتے ہیں جیسے ان جیسے ایک بزرگ نے رات کو ہوٹل کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کمرے کے لیے پوچھا۔ اندر سے آواز آئی۔ "کون؟" کہا۔ "ہم ہیں علامہ سرکار شریعت' حافظ قادری صوفی چشتی صابری ثم لاہوری-----"

تو چوکیدار نے گھبرا کر اندر ہی سے جواب دیا۔ "معاف کیجئے صاحبان! ہوٹل میں اتنے آدمیوں کے لیے جگہ نہیں۔"

سیاست میں ہم خیال جماعت سے اتحاد کرتے ہیں۔ ہم خیال سے مراد وہ جو ان کی "ہم" کا خیال رکھے۔ اسمبلی میں ان کے ارکان کی تعداد اتنی ہوتی ہے کہ ساتھ تقریباً لگانا پڑتا ہے۔ گول میز کانفرنس کا اتنا ذکر کرتے ہیں کہ مریدوں نے گھر کی میزیں گول کرنا شروع کر دیں۔ اگرچہ کانفرنس وہ جگہ ہوتی ہے جہاں لوگ وہ کہتے ہیں جو کرنا چاہیے اور جلوس وہ جگہ ہوتی ہے جہاں لوگ وہ کرتے ہیں جو کہنا چاہیے۔ بہرحال وہ کہتے ہیں' ملک کے دو ٹکڑے اس لیے ہوئے کہ یحییٰ خان کے پاس گول میز نہ تھی' لیکن بقول پگاڑہ مولانا کے گھر میں تو میز ہی نہیں' گول میز تو دور کی بات ہے۔ موصوف کا گھر محلے میں ہے جبکہ سیاست دانوں کے گھر میں تو کئی محلے ہوتے ہیں۔ پوچھو گھر سجانا ہو تو کیا کرتے ہیں؟ کہیں گے خود گھر آ جاتا ہوں۔ "خواتین" کا بے نظیر احترام کرتے ہیں۔

مولانا دو ہزار کافر مسلمان کر چکے ہیں۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے' ہم تو ایک کافر کو ہی بمشکل مسلمان بنا سکے۔ دوسری کو بنانے لگے تو پہلی نے کیس کر دیا۔ دوران گفتگو عروسی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یوں پہلو بدلتے ہیں جیسے رائے صاحب پارٹیاں بدلتے ہیں۔ گفتگو میں الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے لگتے ہیں جمعیت علمائے پاکستان کے عہدیداران

کا انتخاب کر رہے ہیں۔ مولانا الیکشن میں صرف اسے کھڑا کرتے ہیں جو کھڑا ہوتا رہا ہو یعنی انہیں دیکھ کر کھڑا ہوتا رہا ہو۔ ان کے پی اے سے وقت لیے بغیر کوئی انہیں نہیں مل سکتا' بلکہ لگتا ہے وہ اپنے پی اے سے وقت لیے بغیر خود سے بھی نہیں ملتے۔ مزاج اور مزاح برار ہو تو بہت برا لگتا ہے۔ بہت اچھا ہو تو صرف اچھا لگتا ہے۔ مخصوص انداز سے بولتے ہی نہیں' چپ بھی مخصوص انداز سے ہوتے ہیں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہیں' لیکن جسے معاف کرنا چاہیں' اسے اینٹ کا جواب اینٹ ہی سے دیتے ہیں۔ ان کا مشورہ بھی کارکنوں کے لیے حکم ہوتا ہے۔ مرید تو ان کی تجویز کو بھی تعویذ سمجھتے ہیں۔ اس قدر انا کہ کوئی کہہ دے کہ آپ تو بوڑھوں کی طرح چلتے ہیں تو کہیں گے' نہیں بوڑھے میری طرح چلتے ہیں۔

وہ جگہ جہاں ناپسندیدہ افراد کا سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے' سسرال کہلاتی ہے اور مولانا صاحب کی بیوی سعودی عرب کی ہیں۔ صحافیوں میں ان کی افطاری کی بریانی بہت مشہور ہے۔ وہ اتنی لذیذ ہوتی ہے کہ اگر مولانا سیاست نہ بھی کرتے' تب بھی انہیں روزگار کی فکر نہ ہوتی۔ لوگ ان سے اپنا نکاح اور دوسرے کا جنازہ پڑھوانا بڑی سعادت سمجھتے ہیں اور اکثر مذہبی لوگ ہر سال یہ سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہر کام مسلمانوں کے لیے کرتے ہیں۔ وہ تو پان بھی یوں کھاتے ہیں جیسے مسلمانوں کے لیے کھا رہے ہیں۔ یہی نہیں وہ تو کہتے ہیں۔ "میں پان نہیں کھا رہا ہوتا' دراصل مسلمانوں کی امداد کر رہا ہوتا ہوں۔ کیونکہ پان انڈونیشیا' بنگلہ دیش اور سری لنکا سے آتا ہے اور زیادہ تر اس کا مسلمان ہی کاروبار کرتے ہیں۔ یوں اگر میں نے پان چھوڑ دیئے تو مسلمانوں کو نقصان ہو گا۔"

مزاروں پر ہم نے کسی پیر کو جاتے نہیں دیکھا' مریدوں کو ہی دیکھا۔ جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پیر مزار کے اندر ہوتے ہیں۔ لیکن مولانا پہلے سیاست دان ہیں جن کی الیکشن کمپین میں مردے بھی زندوں کی طرح حصہ لیتے ہیں۔ ان کے سیاست میں آنے سے پہلی بار "مزار" کا لفظ سیاست میں آیا کیونکہ وہ "مزاری" سیاست دان ہیں۔

• بابا جمہورا

بابا جمہورا کو میں بزرگ سیاست دان اس لیے نہیں کہتا کہ وہ خود بزرگ ہوں تو ہوں' اس کی سیاست میں ابھی لڑکپن ہے۔ اس وقت سے سیاست میں ہیں جب انہوں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سیاست میں نووارد ہیں۔ اتنے بڑے سیاست دان ہیں کہ اکیلے پارٹی میں پورے نہیں آ سکتے۔ سو دوسری پارٹیوں سے اشتراک کر کے اپنے رہنے کی جگہ بناتے ہیں۔ کچھ لوگ انہیں اقلیتوں کا رہنما مانتے ہیں۔ ویسے ان کی پارٹی کے ممبروں کی تعداد دیکھ لیں تو آپ بھی مان جائیں گے۔

ہمارے ہاں آج کل اگر آپ اپنا شجرہ نسب اور سارا خاندانی کچا چٹھا معلوم کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی لائبریری میں جانے کی ضرورت نہیں' سیاست میں آ جائیں۔ مخالفین خود ہی بتا دیں گے کہ آپ کے دادا پڑدادا کیا کیا کرتے رہے۔ نوابزادہ صاحب نے سیاست کو عبادت بنا دیا ہے' جس سے یہ پتہ چلے نہ چلے کہ وہ سیاست کو کیا سمجھتے ہیں' یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ عبادت کو کیا سمجھتے ہیں۔ ان کی پوری زندگی میں ان کی پیدائش کے علاوہ کوئی غیر سیاسی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ وہ تو صبح اٹھ کر ایک سیب بھی یوں کھاتے ہیں جیسے اپنی صحت کے لیے نہیں' جمہوریت کی صحت کے لیے کھا رہے ہوں۔ ان کی تو چھینک تک غیر سیاسی نہیں ہوتی۔ تشدد کے اس قدر خلاف کہ سکول میں ضرب سے کنی کتراتے۔ تقسیم تو کبھی کی ہی نہیں' البتہ جمع ایسی کرتے کہ حساب کا ماسٹر بے حساب داد دیتا۔ ذہین اتنے کہ جس روز ماسٹر شیو بڑھائے بغیر استری کے کپڑے پہن کر کلاس روم میں آتا' انہیں فوراً پتہ چل جاتا کہ آج ماسٹر صاحب اردو شاعری پڑھائیں گے۔ مزاج ایسا جمہوری کہ ایچی سن کالج میں کرکٹ کھیلتے وقت فیلڈنگ کے دوران اسی گیند کو پکڑنے بھاگتے' جس کی طرف سب سے زیادہ کھلاڑی بھاگتے۔

پیر پگاڑا نوابزادہ کو نابالغ سیاست دان کہتے ہیں۔ ان کے بقول نوابزادہ کا مطلب ہی نواب

کا لڑکا ہوتا ہے۔ اصغر خان فرماتے ہیں' نوابزادہ صاحب ۸۰ فیصد شاعری اور ۲۰ فیصد سیاست کرتے ہیں۔ انہوں نے سیاست اور اپنی شاعری کی کتاب کا نام "جمہوریت" رکھا۔ ایک صاحب سے کہا۔ "دیکھیں یہ نام ٹھیک ہے یا بدل دیں؟" اس نے ان کی شاعری پڑھ کر کہا۔ "نام تو ٹھیک ہے' شاعری بدل دیں۔"

حقہ اور نواب زادہ صاحب اس قدر لازم و ملزوم ہیں کہ دونوں کی شخصیت ٹوپی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ مادر ملت فاطمہ جناح نے ایک بار کہا تھا۔ "نوابزادہ نصر اللہ خان حقے کے بغیر کچھ بھی نہیں۔" حالانکہ ان کے پاس حقہ نہ بھی ہو' تب بھی لگتا ہے کہ ہے۔ حقے کی "نے" منہ میں یوں دبائے ہوتے ہیں جیسے مخالف کی گردن۔ وہ حکم عدولی برداشت کر لیتے ہیں مگر حقہ عدولی نہیں۔ حقہ وہ ساتھی ہے جو اس وقت بولتا ہے جب آپ چاہتے ہیں۔ مارشل لاء کے دنوں میں جب کوئی نہیں بولتا' حقہ پھر بھی بولتا ہے۔

حقہ اجتماعیت کی علامت ہے اور سگریٹ الگ الگ کرنے کی۔ وہ سیاست کا حقہ ہیں جس کے گرد کئی پارٹیاں کش لگا رہی ہیں۔ ان کی پسندیدہ موسیقی تازہ حقے کی آواز ہے۔ وہ حقہ نہ بھی پی رہے ہوں' پھر بھی دھواں دیتے ہیں۔ سگار بھی پیتے ہیں جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ سگار صرف پیئے ہی جا سکتے ہیں' کھائے جانے سے تو رہے۔

کھانے میں مچھلی پسند ہے۔ مچھلی اور سیاست دانوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ دونوں سانس لینے کے لیے منہ کھولتے ہیں۔ البتہ ایک مچھلی پورے جل کو گندا کر دیتی ہے مگر دو سیاستدان مل کر بھی یہ نہیں کر سکتے' البتہ نہ مل کر کر سکتے ہیں۔ جمہوریت کے لیے کوششیں کرنے والوں کو جو پھل ملتا ہے' وہ نواب صاحب کے باغ کے آم ہوتے ہیں جو عام نہیں ہیں۔ ہمیں تو آم میں یہی خوبی لگتی ہے کہ یہ کھایا بھی جا سکتا ہے اور پیا بھی۔ انہیں سنترہ بھی اچھا لگتا ہے مگر ہمیں تو یہ سنتری کا مذکر لگتا ہے۔

نوابزادہ صاحب کئی دہائیوں سے وہی کر رہے ہیں جس کی دہائی آج دے رہے ہیں' وہ ہے اتحاد بنانا۔ ہر حکومت کے خلاف اتحاد بناتے ہیں۔ جس حکومت کے خلاف اتحاد نہ بنائیں اس میں اتحاد نہیں رہتا۔ ان کا بنایا اتحاد اتنا پائیدار ہوتا ہے کہ اب تو لوگ

انہیں اپنے بچوں کی شادیوں پر بھی بلانے لگے ہیں تا کہ نومولود اتحاد اٹوٹ ہو۔ ان کی طبیعت خراب ہو تو ڈاکٹر کہتا ہے۔ "تین دن تک نہار منہ اتحاد بنائیں' انشاء اللہ افاقہ ہو گا۔" ہاتھوں اور دلوں کو جوڑتے رہتے ہیں۔ قوالی پسند ہے۔ شاید اس کی وجہ یہی ہو کہ اس میں بہت سے لوگ اتحاد کر کے یوں گاتے ہیں کہ کسی ایک کی آواز بھی صاف سنائی نہیں دیتی۔ قوالی بندہ فاصلے سے سنے تو بہت مزہ آتا ہے۔ یعنی اتنے فاصلے سے جہاں تک آواز نہ آتی ہو۔

سیاست کو انہوں نے کبھی دکان نہیں سمجھا۔ ویسے بھی سیاست میں دوکان تو کیا' ایک کان کی بھی ضرورت نہیں۔ البتہ زبان چاہیے اور ان کی زبان ایسی ہے کہ اتنی ان کے منہ میں نہیں رہتی' جتنی صحافیوں کے کانوں میں رہتی ہے۔ ان کی تقریر بہرے بھی سمجھ جاتے ہیں کیونکہ اتنا منہ سے نہیں' جتنا ہاتھوں سے بولتے ہیں۔ ہر سوال کا جواب سوچ کر دیتے ہیں۔ نام تک پوچھیں تو سوچ میں پڑ جائیں گے۔ گفتگو کا ایسا انداز کہ بندہ بات سننے سے پہلے ہی کنونس ہو جائے۔ شاید کنونس ہونے کی وجہ بھی یہی ہو۔ ویسے ہم ایک ایسے سیاست دان کو جانتے ہیں جو روز کنونسنگ کے لیے نکلتے ہیں۔ کئی دنوں کے بعد آخر ان سے ایک خاتون کنونس ہو ہی گئیں۔ اب وہ ماشاء اللہ ان کے بچوں کی ماں ہے۔ نواب صاحب کی تقریر کا آغاز اور انجام تقریر کو دلکش بنا دیتا ہے۔ تقریر اور بھی دلکش بن سکتی ہے' بشرطیکہ اختتام آغاز سے پہلے کا ہو۔

وہ ان سیاست دانوں میں سے ہیں جو عوام کے نمائندہ نہیں' سیاست دانوں کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے سیاست دان جو کام سب سے زیادہ کرتے ہیں' وہ غور ہے۔ نواب صاحب پوزیشن بنا کر نہیں' اپوزیشن بنا کر خوش ہوتے ہیں۔

وہ پیدائشی حزب اختلاف ہیں۔ اب تو ان کی اس عادت کی وجہ سے یہ صورت حال ہے کہ اگر وہ کسی بات پر فوراً متفق ہو جائیں تو لوگ پریشان ہو جاتے ہیں کہ اللہ کرے ان کی طبیعت ٹھیک ہو۔ گھڑ سواری کرتے ہیں۔ اب بھی کرسی پر بیٹھے باتیں کرتے ہوئے دائیں ٹانگ سے کرسی کو ایڑ لگا رہے ہوتے ہیں۔ ٹانگ اس قدر پسند ہے کہ

کھانے میں مچھلی کا بھی لیگ پیس ہی مانگتے ہیں۔ مارک ٹوئن نے کہا۔ "صحت مند رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ کھاؤ جو آپ کو پسند نہیں' وہ پیو جو آپ نہیں چاہتے اور وہ کرو جو آپ ویسے کبھی نہ کرتے۔" اس حساب سے انہوں نے کبھی صحت مند رہنے کی کوشش نہیں کی۔ پرانی چیزیں دیکھنا پسند ہیں' اس لیے کمرے میں آئینہ ضرور رکھتے ہیں۔ اپنی چیزیں نہیں بدلتے۔ ان کا وہ برش جس سے شیو کرتے وقت صابن لگاتے ہیں' اتنا پرانا ہو گیا ہے کہ اس کے آدھے بال سفید ہو چکے ہیں۔ جمہوریت میں مارشل لاء کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ مارشل لاء میں جمہوریت کی راہ بناتے ہیں اور ہمیشہ راہ میں ہی رہتے ہیں۔ حکومت میں کبھی نہیں رہے کیونکہ کبھی عہدہ ان سے بڑا ہوتا ہے اور کبھی وہ عہدے سے بڑے نکلتے ہیں۔ مظفر گڑھ جو کبھی ان کا گڑھ تھا' اب ان کے لیے گڑھا بن گیا ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے جنازے پر نہ گئے مگر غفار خان کے جنازے پر گئے' جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ سرحدی گاندھی غفار خان پر یہ یقین کرنے گئے تھے کہ واقعی سرحدی گاندھی غفار خان مر گئے ہیں۔

مزاج ایسا کہ سردیوں میں گرمیاں اور گرمیوں میں سردی چاہتے ہیں۔ صحافی ان کے پاس خبر لینے یوں جاتے ہیں جیسے ان کی خبر لینے جا رہے ہوں۔ بھینسیں پالنے کا شوق ہے۔ سنا ہے جو بھینس نہیں پالتے ہیں' وہ اچھے شوہر ثابت ہوتے ہیں۔ اس قدر وضع دار کہ جس جگہ ایک بار پاؤں پھسلا' جب بھی وہاں سے گزرے' پھسل کر ہی گزرے۔ ان کی پوری زندگی سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سیاست بچوں کا کھیل نہیں' بوڑھوں کا ہے۔

○○○

• اصغر اعظم

یہ وہ زمانہ تھا جب جموں اور سری نگر میں تعلیمی سہولتیں اتنی تھیں کہ ایک طالب علم نے کہا۔ "میں اس وقت چوتھی جماعت میں تھا جب میں نے پہلی مرتبہ سکول ٹیچر دیکھا۔" ان دنوں وہاں ایک ہیڈ ماسٹر اپنی کلاس کے بچوں کو تقریر کرنا سکھا رہا تھا۔ ہر بچے کو بتاتا کس طرح بولنا ہے۔ ایک بچہ آیا تو ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ "تم صرف یہ سیکھو کہ چپ کیسے ہونا ہے؟" یہ بچہ بڑا ہو کر پاک فضائیہ کا پہلا اور دنیا کا سب سے کم عمر کمانڈر انچیف بنا۔ پوری قوم نے اسے "شاہین" کہا مگر حنیف رامے نہ کہتے۔ کسی نے وجہ پوچھی تو بولے۔ "میں جب انہیں شاہین کہہ کر بلاؤں' لوگ سمجھتے ہیں میں اپنی پہلی بیوی کو بلا رہا ہوں۔"

دیکھنے میں اپنے بیٹے اصغر عمر خان پر گئے ہیں۔ بچپن ہی سے ان میں سیاست دانوں والی صلاحیتیں موجود تھیں۔ اگر کلاس میں کامیاب نہ ہوتے تو گھر والوں کو یہ نہ کہتے کہ میں ناکام ہوا ہوں' کہتے دھاندلی ہوئی ہے۔ والد اس قدر سخت تھے کہ انہیں لگتا' میں گھر میں نہیں' سکول میں پیدا ہوا ہوں۔ آدمی انہیں الٹا ہو کر دیکھے تو سیدھے سادے آدمی ہیں۔ وطن کا دفاع کر کر کے اب یہ حال ہو گیا ہے کہ دوران گفتگو بھی دفاعی پوزیشن میں رہتے ہیں۔ کسی سے پانچ روپے بھی وصول کرنے ہوں تو ضرور کریں گے' چاہے وصول کرنے میں سو روپے لگ جائیں۔ اس قدر ذمہ دار کہ اگر انہوں نے آپ کو نیند کی گولی کھلانا ہو تو وقت پر کھلائیں گے' چاہے اس کے لیے انہیں آپ کو سوتے میں اٹھانا پڑے۔ جو غلطی ایک بار کی' پھر اسے کبھی نہیں دہرایا۔ ہمیشہ نئی غلطی کی۔ عمر اور ارادہ پختہ' البتہ عمر کا پوچھو تو عمر اصغر خان کا بتانے لگتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے ہاں سیاست کا یہ حال ہے کہ لیڈر عوام کے حال کے بجائے ان کے ماضی کو ہی بہتر بناتے ہیں بھی ایسے کہ عوام کا وہ حال کرتے ہیں کہ اسے ماضی بہتر لگنے لگتا

ہے۔
اصغر خان کہتے ہیں۔ "سیاست میں میرا آنا ایک حادثہ ہے۔" سیاست کو یہ حادثہ ۱۹۶۸ء میں پیش آیا۔ بھٹو صاحب نے کہا تھا۔ "ایوبی دور میں میری نظر بندی نے دو شخصیتوں کو لیڈر بنایا' ایک بیگم نصرت بھٹو تھی اور دوسرے بے غم اصغر۔" خان صاحب نے سکول میں اتنی بار اے بی سی ختم نہ کی ہو گی جتنی سیاسی اتحاد بنا بنا کر کی۔ مثلاً جے یو آئی' پی این اے' ایم آر ڈی اور پی ڈی اے وغیرہ وغیرہ۔ وہ فاتح سیاست ہیں۔ اندرون ملک ان کا دورہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کے دورے کا سنتے ہی حکومت ایمبولینس روانہ کر دیتی ہے۔
جب فوج میں تھے تو ہمیشہ خطرناک کام سب سے پہلے خود کرتے' پھر جونیئرز کو اس کی اجازت دیتے۔ یہاں تک کہ شادی بھی پہلے خود کی۔ ہوائی اور ہوائی جہاز اڑانے کے ماہر ہیں۔ کہتے ہیں جب میں ائیر مارشل تھا تو کبھی کسی نے یہ شکایت نہ کی کہ چھلانگ لگاتے ہوئے اس کا پیرا شوٹ نہیں کھلا۔ پی آئی اے میں آئے تو اسے اتنا آرگنائز کیا کہ ہر کام کے لیے الگ سٹاف رکھا۔ یہاں تک کہ مسافروں کی خدمات کرنے کے لیے الگ عملہ ہوتا اور نہ کرنے کے لیے الگ۔ خان صاحب آج کل بھی Plan کو Plane سمجھتے ہیں۔ ڈرائیور ایسے کہ ان کی گاڑی کے آگے آنے والے کو اتنا خطرہ نہیں ہوتا جتنا پیچھے آنے والے کو۔
عمر اصغر خان دراصل کم عمر اصغر خان ہیں۔ اس لیے معمر اصغر خان صرف نو عمر اصغر خان کے مشورے پر ہی عمل کرتے ہیں۔ کہتے ہیں میری پارٹی اکیلی ہی پی پی کو ہرا سکتی ہے اور ۱۹۹۰ء میں انہوں نے اکیلے پی پی سے اتحاد کر کے اسے ہرا کے دکھا دیا۔ واحد سیاستدان ہیں جو مقابلہ میں بھی کھڑے ہوں تو ہار جائیں۔ جتنی محنت سے وہ ہارتے ہیں' اس سے کم محنت میں بندہ جیت سکتا ہے۔ ان کا حلقہ انتخاب ہمیشہ ہلکا انتخاب رہا۔ ہر الیکشن پر وعدہ کرتے ہیں کہ الیکشن کے بعد اس حلقے کو بدل کر رکھ دیں گے۔ واقعی الیکشن کے بعد اس حلقے کو بدل کر کسی اور جگہ سے الیکشن لڑتے ہیں۔ صرف چار

بار الیکشن ہارے۔ جس کی ایک وجہ تو یہ رہی کہ وہ صرف چار بار ہی الیکشن کے لیے کھڑے ہوئے۔ ہار تو انہیں اس قدر پسند ہے کہ کوئی کسی اور کے لیے لایا ہو تو بھی وہ اپنی گردن آگے کر دیتے ہیں۔ بقول پیر پگاڑا "انہیں ہمیشہ کرسی ملی مگر اپنے گھر کے لاؤنج میں۔" یہ وہ ہوا باز ہیں جنہوں نے تمام حادثے ہائی وے پر کیے۔ وہ بھی یوں کہ لوگ ہائی وے کی بجائے "ہائے وے" کہہ اٹھے۔ وہ اسی سیاسی پارٹی کے سربراہ ہیں جسے ووٹ لینے کے لیے ہی کمپین نہیں چلانا پڑتی' امیدوار لینے کے لیے بھی یہی کچھ کہنا پڑتا ہے۔

ونسٹن چرچل نے کہا تھا۔ "سیاست اور جنگ دونوں ایک جیسی خطرناک ہوتی ہیں' البتہ جنگ میں آپ صرف ایک بار مارے جاتے ہیں لیکن سیاست میں بار بار۔" اور اگر سیاست دان خان صاحب جیسا ہو تو ہر بار۔ اگرچہ ان کا دبدبہ اب دب دبا گیا ہے مگر پھر بھی ہر بات پر کہتے ہیں۔ "میری نہ مانی گئی تو اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔" اور بقول شفیق الرحمٰن یہ کون سا مشکل کام ہے۔ اس کے لیے صرف دو اینٹیں ہی تو چاہییے ہوتی ہیں۔ فرماتے ہیں۔ "ہم ملک میں امن و امان قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جس نے ہمیں روکنے کی کوشش کی' ہم اسے کچل دیں گے۔" لوگ کہتے ہیں۔ "اصغر خان صاحب تاریخ کو دہراتے ہیں مگر اس سے سبق نہیں سیکھتے۔" حالانکہ وہ تو اس مقام پر ہیں کہ تاریخ کو خود ان سے سبق سیکھنا چاہیے۔ ذوالفقار علی بھٹو صاحب محبت سے خان صاحب کو ایسے نام سے پکارتے جس سے بھٹو صاحب کی خان صاحب سے اتنی محبت ظاہر نہیں ہوتی' جتنی سبزیوں سے۔ ویسے تو محبت اور روزنامہ "جنگ" میں سب جائز ہوتا ہے۔

اصغر خان صاحب دوسروں کی خامیوں کی اس قدر دلجمعی سے اصلاح کرتے ہیں کہ بعد میں پتہ چلتا ہے' موصوف ساتھ خوبیوں کی بھی اصلاح کر گئے ہیں۔ کہتے ہیں۔ "ہر مصیبت کا سامنا مسکرا کر کرتا ہوں۔" یہ بات انہوں نے بیگم ممتاز رفیع کے سامنے کہی۔ انہیں اپنی پارٹی کے ہر کارکن کا نام آتا ہے' لیکن اس کی وجہ ان کا حافظہ نہیں'

کارکنوں کی تعداد ہے۔ خان صاحب میں اس قدر استقلال ہے کہ آج بھی وہیں ہیں' جہاں بیس سال پہلے تھے۔ انھوں نے تحریک استقلال کو یوں چلایا جیسے کوئی ہیڈ ماسٹر کمیٹی کا سکول چلاتا ہے۔

ایک بار انھوں نے تقریر میں اپنی زندگی کی کہانی ان لفظوں میں سمیٹی۔ "میں وطن کا سپاہی تھا' وطن کا سپاہی ہوں اور وطن کا سپاہی رہوں گا۔" تو پیچھے سے آواز آئی۔ "ترقی نہ کرنا۔" اس کے باوجود وہ جس امیدوار کو چاہیں الیکشن میں جتوا سکتے ہیں۔ انہیں بس اتنا ہی کرنا پڑتا ہے کہ اس امیدوار کے خلاف خود کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ویسے ایک تجزیہ نگار کے خیال میں وہ خود بھی الیکشن جیت سکتے ہیں۔ بس انہیں یہ کرنا ہو گا کہ وہ اس حلقے سے الیکشن لڑیں جہاں سے اصغر خان الیکشن لڑ رہا ہو۔

○○○

• مولانا دستار نیازی

۱۹۳۶ء میں پنجاب یونیورسٹی ہال میں ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ "جناح کو معزول کیا جائے۔" ہال سے پاٹ دار آواز ابھری اور سب آوازوں پر چھا گئی۔ "بد بختو! ہم یہ تسلیم نہیں کرتے۔"

یہ آواز آج بھی ہماری سیاست میں اتنی ہی بلند ہے۔ کم از کم "بد بختو" تو آج بھی اتنے ہی زور سے کہتی ہے۔ اسے آج ہم مولانا دستار نیازی کے نام سے پہچانتے ہیں۔ ان کو دور سے دیکھو تو جو چیز سب سے پہلے نظر آتی ہے' وہ ان کی دستار ہی ہے۔ جس کا طرہ جیسے ان کے سر پر پچاس برسوں سے کھڑا ہے' ایسے تو ہماری سیاست میں کوئی لیڈر پچاس ماہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ مولانا جب نوجوان تھے تو ۹ جون تھے۔ اب ان کا بڑھاپا جوانی پہ ہے مگر آج بھی ایسا دبدبہ کہ کوئی کہے کہ میں نے انہیں دبایا ہے تو یقین کر لیں' اس نے ان کی ٹانگوں کو دبایا ہو گا۔ سیاست میں کبھی ڈنڈی نہیں ماری' ہمیشہ ڈنڈا مارا ہے۔ وہ داڑھی' آنکھیں' ڈنڈا اور سینہ نکال کر چلتے ہیں اور کسی کی نہیں چلنے دیتے۔ ان کے سامنے اگر کسی کی چل رہی ہوتی ہے تو وہ سانس ہی ہوتی ہے۔ غصے میں ایسے ہی نظر آتے ہیں جیسے تصویر میں دکھتے ہیں۔ بغیر داڑھی اور غصے کے ہم نے انہیں نہیں دیکھا۔

میاں والی کے میاں ہیں۔ ایسے گھر میں پیدا ہوئے جہاں بندہ ایک رات بسر کر لے تو یہی سمجھتا ہے رات مسجد میں ٹھہرا تھا۔ وہ تو تب بھی مولانا تھے' جب ابھی ان کی داڑھی نہ تھی۔ مولویوں کی طرح سوچتے مگر کہتے نیازیوں کی طرح ہیں۔ یعنی زبان سے سوچتے اور ہاتھ سے کہتے ہیں۔ بچپن میں سکول میں مانیٹر تھے اور ساری کلاس کے لڑکوں کو نماز پڑھانے لے کر جاتے اور خود ڈنڈا پکڑ کر انہیں دیکھتے رہتے کہ کوئی آدھی نماز پڑھ کر تو نہیں کھسک رہا۔ کلاس نہ رہی مگر وہ ہمیشہ مانیٹر رہے۔ آج بھی گفتگو میں

ان کے پاس جو سب سے وزنی دلیل ہوتی ہے' وہ ان کے دائیں ہاتھ نے تھامی ہوتی ہے۔ دوسرے سے جس لہجے میں بات کرتے ہیں' اس سے پتہ چلے نہ چلے کہ وہ دوسرے کو کیا سمجھتے ہیں' یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ دوسروں کو بہرہ سمجھتے ہیں۔ ایک بندے سے بھی بات کر رہے ہوں تو لگتا ہے عالم اسلام سے مخاطب ہیں۔

وہ واحد سیاست دان ہیں جو ابھی تک واحد ہیں۔ ان سے پوچھو۔ "حضرت ذرا عمر بتائیں۔" تو حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا بتانے لگیں گے۔ ویسے بھی ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی تو ان کی شادی بھی نہیں ہوئی۔ آج تک جتنی دعائیں مولانا کی شادی کے لیے مانگی گئی ہیں' شاید ہی کسی اور کے لیے کی گئی ہوں۔ مسجدوں' عید گاہوں اور گھروں میں ہر زبان پر یہی خواہش ہوتی ہے۔ یہی نہیں ہر پاکستانی حکومت یہی وعدہ کر کے بر سر اقتدار آتی ہے کیونکہ مولانا نے اعلان کیا ہے کہ اس وقت تک شادی نہ کروں گا' جب تک ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ نہ ہو جائے۔ اس سے قبل اداکارہ شمیم آراء نے اعلان کیا تھا کہ میں اس سے شادی کروں گی جو کشمیر فتح کرے گا۔ جس سے ہمیں ابھی تک کشمیر فتح نہ کرنے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ ہو سکتا ہے پاکستان کی ہر بر سر اقتدار حکومت دراصل مولانا کی شادی میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے اسلام نافذ نہ کرتی ہو۔ مولانا عورت کی حکمرانی کے حق میں نہیں' اگر ہوتے تو شادی شدہ ہوتے۔ فرماتے ہیں۔ "میری بیوی نہیں' اس لیے سارا وقت سیاست کو دیتا ہوں۔" فخر امام صاحب کہتے ہیں۔ "میری بیوی ہے' اس لیے سارا وقت سیاست کو دیتا ہوں۔" مولانا نے سیاست کو بیوی کا وقت ہی نہیں' مقام بھی دیا ہے۔

فرانس کے مثالی سیاست دان رابرٹ شوماں عمر بھر کنوارے رہے۔ ایک صحافی نے وجہ پوچھی تو بولے۔ "میں ساری عمر مثالی بیوی کی تلاش میں رہا۔" صحافی نے پوچھا۔ "وہ ملی؟" کہا۔ "ہاں ملی' مگر وہ خود مثالی خاوند کی تلاش میں تھی۔"

کنوارہ بندہ وہ ہوتا ہے جسے پتہ ہوتا ہے کہ اس کی مہینے کی تنخواہ کہاں جاتی ہے۔ مولانا کا یہ مسئلہ بھی نہیں۔ انہوں نے تن کو جن آلائشوں سے پاک رکھا' ان میں تن...خواہ

بھی ہے۔ اگرچہ امارت ایسی چیز ہے جسے ہم خود بڑی مشکل سے برداشت کرتے ہیں۔ جی ہاں' دوسرے کی امارت۔ ویسے بھی غریب ایسی چیز ہے جس پر تمام سیاست دان فخر کرتے ہیں اور اس وقت تک فخر کرتے ہیں جب تک وہ خود غریب نہیں ہوتے۔ مگر مولانا دولت کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں اور انہیں میلے ہاتھ پسند نہیں۔

سنا ہے دنیا میں سب احمق نہیں ہوتے' کچھ کنوارے بھی ہوتے ہیں۔ مولانا تو مجرد ملت ہیں۔ سنا ہے مولانا دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے۔ ویسے ہمارا خیال ہے بیوی سے ڈرتے ہیں۔ اگر نہ ڈرتے ہوتے تو شادی شدہ ہوتے۔ ایک صحافی نے کہا۔ "آپ ہمارے دادا کی جگہ ہیں' اب شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" کہا۔ "اسی لیے نہیں کرتا کہ دادی سے شادی کرتا کون اچھا لگتا ہے۔"

مولانا نوجوانی میں منہ پر اختلاف کرتے اور کبھی کبھی اختلاف اتنا گہرا ہوتا کہ ڈاکٹر کو اس کی گہرائی کم کرنے کے لیے پٹی کرنا پڑتی۔ ویسے تو اب بھی وہ اس عمر میں ہیں جس میں ہمارے ہاں بات سننے کے لیے آلہ سماعت اور سنانے کے لیے ڈنڈا استعمال ہوتا ہے۔ انہیں لٹھ اور لٹھا پسند ہے۔ ۱۹۵۵ء میں گورنر جنرل غلام محمد کو چڑیوں کا مغز کھلانے کے لیے لکھنؤ سے جو پچانوے سالہ حکیم آئے' ان کے ساتھ جوان بیوی تھی جس کی گود میں بچی تھی' جسے حکیم صاحب اپنے نسخوں کے تیر بہدف ہونے کے ثبوت کے طور پر ساتھ ساتھ رکھتے۔ مولانا اسی مقصد کے لیے ڈنڈا ساتھ ساتھ رکھتے ہیں۔ وہ تو پریس کانفرنس میں بھی یوں آتے ہیں جیسے سکول ماسٹر ڈنڈا لے کر کلاس میں آتا ہے۔

مولانا نیازی جوانی میں بیک وقت تین آدمیوں سے کشتی لڑ سکتے تھے۔ ویسے تو نیازی ایسے ہوتے ہیں کہ جنرل نیازی اس بڑھاپے میں بھی بیک وقت تین آدمیوں سے کشتی ہار سکتے ہیں۔ مولانا ایسی بڑی شخصیت ہیں کہ کھانے کی میز پر موجود ہوں تو ان کے لیے واحد حاضر کی بجائے جمع حاضر کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ لوگوں کا سر بھاری ہو تو اسپرین کھاتے ہیں' ان کا سر بھاری ہو تو غصہ کھاتے ہیں۔ ہر کام اسلام کے لیے کرتے ہیں۔

وہ تو ناشتہ بھی اپنے لیے نہیں اسلام کے لیے کرتے ہیں۔ جو بات صحیح سمجھتے ہیں' کہہ دیتے ہیں اور جو بات کہہ دیتے ہیں' اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ درست بات یوں کرتے ہیں کہ درشت بات لگتی ہے۔ جانتے ہیں سچ کڑوا ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی جو بات دوسروں کو جتنی کڑوی لگے' سمجھتے ہیں اتنی سچی ہے۔ کوئی کام آرام سے نہیں کرتے۔ وہ تو آرام سے آرام بھی نہیں کرتے۔ ہم نے آج تک انہیں تھکا ہوا نہیں دیکھا۔ اگر آپ کو کبھی وہ تھکے تھکے لگیں تو اس کی وجہ یہ ہو گی کہ آپ خود تھکے ہوئے ہیں۔

طبیعت ایسی جلالی کہ دعا بھی یوں مانگتے ہیں جیسے سود خور پٹھان قرض۔ ہر مسئلے پر سب سے پہلے ڈٹ جاتے ہیں۔ اکثر تو مسئلے سے پہلے ہی ڈٹ جاتے ہیں۔ نماز کے اس قدر پابند کہ وہ تو ہم عصر بھی اسے مانتے ہیں' جس کے ساتھ عصر پڑھی ہو۔ عورتوں کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ خواتین کو دیکھ کر ہم بھی آنکھ بند کر لیتے ہیں' بس راستہ دیکھنے کے لیے ایک آنکھ کھلی رکھتے ہیں۔

سیاست میں جوشیلے نوجوان کے طور پر داخل ہوئے۔ آج تک اپنی کسی بات سے نہیں پھرے۔ یہاں تک کہ آج بھی اتنے ہی جوشیلے اور نوجوان ہیں۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں تھے تو مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن تھے۔ جے یو پی کے جنرل سیکرٹری تھے تو سیکرٹری کم اور جنرل زیادہ تھے۔ تحریک ختم نبوت میں تو انہیں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے ساتھ جب موت کی سزا ملی تو لگا جیسے موت کو سزا ملی۔

مولانا اسلام پورہ میں رہتے ہیں مگر انہیں اسلام پورا پسند ہے۔ اپنی پہلی بات کو آخری بات سمجھتے ہیں۔ اگر آپ نہ مانیں تو ہو سکتا ہے یہ آپ کی بھی آخری بات ہی ہو۔ گدھے گھوڑے کو ایک ہی ڈانگ سے ہانکتے ہیں جس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک ہی ڈانگ ہے۔ ان کی آواز آج بھی اتنی ہی بلند ہے جتنی ۱۹۳۶ء میں تھی' مگر ہمارے سیاستدان سرگوشیاں سننے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ اب انہیں بلند آوازیں سنائی نہیں دیتیں۔ مولانا کی شخصیت کو اگر ایک لفظ میں لکھا جائے تو وہی ہے

جس عنوان سے ان کی آپ بیتی چھپی ہے۔ وہ ہے "میں" ------ ان کی شخصیت "میں" کے گرد گھومتی ہے۔ وہ بات "میں" سے شروع کرتے ہیں۔ بات ختم ہو جاتی ہے مگر "میں" ختم نہیں ہوتی۔

• شی مین

یہ جاننے کے لیے سیاست دان مرد ہے یا عورت' اس کی پالیسیاں دیکھنا چاہئیں اور بے غم عابدہ حسین "صاحب" سیاست کی مرد میدان ہیں۔ کہتے ہیں' عابدہ حسین کو خاتون بنانے کا فیصلہ تو بہت بعد میں کیا گیا' پہلے ان میں ساری مردانہ خصوصیات اکٹھی کی گئیں۔ مگر کاتب تقدیر کی کتابت کی غلطی سے یہ "وہ" بن گئیں۔ جس گھر میں پیدا ہوئی' وہ اتنا بڑا تھا کہ اگر کوئی بدھ کو ملنے جاتا تو چوکیدار کہتا۔ "اس برآمدے میں سیدھے چلے جائیں اور جمعرات کو دائیں مڑ جائیں۔" اس گھرانے کی خواتین کے لباس میں تو گھروں کی بلند دیواریں بھی شامل ہوتیں۔ عورتوں کے دوپٹوں کو بھی غیروں سے پردہ کرایا جاتا۔ شریف شرفاء تو غیروں کے سامنے بیوی کے جوتے کا ماپ تک نہ بتاتے۔ مبادا کوئی ہمدردی کرنے لگے۔ اس گھرانے کو پانچ ہزار ایکڑ کا وارث چاہیے تھا۔ جب تک بے غم صاحبہ پیدا نہ ہوئی تھیں "نشیمن" میں ہر طرف شمعیں جل رہی تھیں اور جب یہ پیدا ہوئیں تو جو چیز جل رہی تھی' وہ ان کی نانی لیڈی مراتب تھیں جنہیں عورت کے "مراتب" کا پتہ تھا۔ خود بے غم عابدہ حسین کو اپنا لڑکی پیدا ہونا اتنا برا لگا کہ اپنی پیدائش کے ایک سال بعد تک انہوں نے کسی سے بات نہ کی' مگر بڑی ہو کر وہ عابدہ حسین کی بجائے عابد حسین بن گئیں۔ یہاں تک کہ جب مارچ ۱۹۷۱ء میں بھٹو صاحب نے انہیں خواتین کی نشست پر الیکشن لڑنے کے لیے کہا تو انہوں نے انکار کر کے پارٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۸۸ء میں جب بے نظیر بھٹو قائد حزب اقتدار تھیں' بے غم صاحبہ کو کہا گیا کہ آپ لیڈر آف دی اپوزیشن بن جائیں تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ خاتون کا مقابلہ کرنا کوئی مردانگی نہیں۔ وہ پہلی خاتون ہیں جو ڈسٹرکٹ کونسل جھنگ کی چیئر "مین" رہیں۔ یہی نہیں وہ شادی میں بھی فخر امام کو بیاہ کر اپنے

گھر لائیں۔ مردوں کے ساتھ مردوں جیسا سلوک کرتی ہیں۔ یہی نہیں عورتوں کے ساتھ بھی مردوں جیسا سلوک کرتی ہیں۔ شیر افضل جعفری صاحب نے ان کی "بڑائی" بیان کرتے ہوئے کہا۔ "کرنل عابد حسین کی یہ بیٹی کئی بیٹوں پر بھاری ہے۔" جنھوں نے بے غم صاحبہ کو دیکھا ہے' وہ کہتے ہیں۔ فقرہ یہ تھا ------ "کرنل عابد حسین کی یہ بیٹی کئی بیٹوں سے بھاری ہے۔"

وہ سیاست میں بے حیثیت عورت نہیں' بحیثیت سیاستدان آئیں۔ ہمارے ہاں ہر بار ایسے سیاست دان جیت کر اسمبلی میں پہنچتے ہیں' جس سے ان کی سیاست دانوں کی اہلیت سے کہیں زیادہ عوام کے حافظے کا پتہ چلتا ہے۔ جی ہاں عوام کے کمزور حافظے کا۔ بے غم صاحبہ پہلی بار جب گھر سے اسمبلی آئیں تو برقع پہن کر۔ پھر اسمبلی میں گھر کر گئیں۔ اب تو اسمبلی میں یوں پھرتی ہیں جیسے گھر میں پھر رہی ہوں۔ سنا ہے وہ جھنگ کے لوگوں کو بہت کم نظر آتی ہیں۔ حالانکہ ہم نے تو انہیں جب بھی دیکھا' بہت نظر آئیں۔ چہرے کے نقوش سے تو ماہنامہ "نقوش" لگتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر یہی لگتا ہے کہ "بھری" بیٹھی ہیں۔ چہرے اور دروازے پر "ڈو ناٹ ڈسٹرب" کا بورڈ لگا ہوتا ہے۔

ہاتھ ایسے نرم کہ ایک صحافی خاتون نے پوچھا۔ "آپ ہاتھوں کو ایسا رکھنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟" کہا۔ "ان کو ایسا رکھنے کے لیے ہی تو میں کچھ نہیں کرتی۔" بچپن میں اپنے پاؤں اٹھا کر مور کی طرح زمین پر رکھتیں۔ یہی نہیں پاؤں بھی مور ہی کی طرح کے رکھتی ہیں۔ بچپن ہی سے سیاست دان بننے کی صلاحیت موجود تھی' یعنی ہر سال اپنی جماعت بدل لیتیں۔ جبکہ ہمارے دوست "ف" تو ایک ہی جماعت سے اتنے کمیٹڈ ہوئے کہ آج کل ان کا ساتویں میں آٹھواں سال ہے۔ غصے میں ایسی انگریزی بولتی ہیں کہ لگتا ہے انگریزی پر انہیں مکمل گرفت نہیں' انگریزی کو ان پر مکمل گرفت ہے۔ کمرے میں انگریزی کتابیں رکھتی ہیں کہ کبھی بندے کا پڑھنے کا دل چاہتا ہے۔ اردو کتابیں بھی رکھتی ہیں کہ کبھی بندے کا دل پڑھنے کو نہیں چاہتا۔

وہ بڑی ہو کر بے نظیر بننا چاہتی ہیں' حالانکہ وہ صرف "چھوٹی" ہو کر یہ بن سکتی ہیں۔
ان میں اور بے نظیر میں وہی فرق ہے جو دونوں کے والدوں میں تھا۔

سیاست میں امام وہ نہیں ہوتا جس کی مرضی پر پیروکار چلیں' بلکہ وہ ہوتا ہے جو پیروکاروں کی مرضی پر چلے۔ فخر امام صاحب پنج وقتی آئینی ہیں۔ ان سے کہو' چاند بہت خوبصورت لگ رہا ہے تو کہیں گے۔ "ہاں' لگتا تو آئین کے مطابق ہی ہے۔" ۱۹۸۵ء میں وہ اسمبلی کے اسپیکر بنے مگر پھر تحریک عدم اعتماد میں انہیں ۷۲ ووٹ ملے اور وہ ہار گئے' تو کسی نے کہا۔ "امام کے ساتھ ۷۲ ہی ہوتے ہیں۔"

فخر امام بے غم صاحب کو اپنی "دنیا" کہتے ہیں۔ کیوں کہتے ہیں' یہ بات گول مول ہے۔
فخر امام صاحب کے لیے وہ فخر بھی ہیں اور امام بھی۔ وہ مرد عورت کی برابری کی قائل ہیں۔ کہتی ہیں مرد اگر با صلاحیت ہو تو وہ عورت کی برابری کر سکتا ہے۔ اگر کوئی مرد ایسا نہ ہو تو اسے برابر کر دیتی ہیں۔ وہ تو تجارتی بنیادوں پر افزائش نسل کے لیے مرغیاں خریدیں تو بھی جتنی مرغیاں خریدیں گی' اتنے ہی مرغے لیں گی۔ ویسے ہم سمجھتے ہیں صرف ایک کام ایسا ہے جو دو مرد تو مل کر سکتے ہیں مگر عورتیں دس مل کر بھی نہیں کر سکتیں۔ وہ ہے "چپ رہنا" بے غم صاحبہ اس موضوع پر بھی بات کر دیتی ہیں جس پر سرگوشی ہی کی جا سکتی ہے۔ جو بات نہ سننا چاہیں' اس کے لیے اپنے کان بند نہیں کرتیں' کہنے والے کی زبان بند کرتی ہیں۔ دوران گفتگو دوسرے کو اپنی سطح پر نہیں لاتیں اور نہ دوسرے کی سطح پر اترتی ہیں۔ بلکہ اپنی سطح پر رہ کر گفتگو کرتی ہیں۔
جھوٹ نہیں بولتیں۔ اس لیے عمر پوچھو تو جواب نہیں دیتیں۔ وہ بول رہی ہوں تو لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں' کیونکہ سیاسی خاتون اور گلوکارہ کی یہ خوش فہمی ہی ہوتی ہے کہ لوگ اسے صرف سننے آتے ہیں۔
جس کلچر پر وہ انگری ہیں' وہ انگری کلچر ہے' لیکن کہتی ہیں۔ "میں جاگیر دارنی نہیں ہوں۔" ٹھیک کہتی ہیں' وہ جاگیر دارنی نہیں ہیں' جاگیر دار ہیں۔ علاقے کے لوگ ان

کو سلام بھی کریں تو لگتا ہے معافی مانگ رہے ہیں۔ گھڑ دوڑ پسند ہے۔ اکثر اس میں حصہ لیتی ہیں۔ یہی نہیں جیتتی بھی ہیں۔ اس قدر مصروف کہ ان کے پاس دن بھر کی مصروفیت کی لسٹ دیکھنے کی فرصت نہیں ہوتی۔ یہی ان کی خوشی کا راز ہے۔ فارغ رہتیں تو اپنے وزن کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان رہتیں۔ نارمل گفتگو بھی کر رہی ہوں تو لگتا ہے ڈانٹ رہی ہیں۔ اس لیے ڈانٹ بھی رہی ہوں تو لگتا ہے نارمل گفتگو کر رہی ہیں۔ ویسے بھی باس اور بارش ہوتی ہی برسنے کے لیے ہے۔

عورت کے تخلیقی کاموں کے اس قدر خلاف ہیں کہ جو تخلیقی کام قدرت نے عورت کے ذمے لگایا' اسے روکنے کے لیے "منصوبہ بندی" کرتی رہیں۔ یوں پاکستان میں جو عورتیں ضبط تولید کی گولیاں کھاتیں' وہ ترقی پسند خواتین کہلاتیں اور جو یہ گولیاں نہ کھاتیں' وہ مائیں کہلاتیں۔ جتوئی صاحب کے دور میں وزیر اطلاعات رہیں۔ ویسے اطلاعات کا شعبہ پیدائشی طور پر خواتین ہی کا ہے۔ آج کل امریکہ میں پاکستانی کلچر کی نمائندہ ہیں۔ پہلے پاکستان میں امریکی کلچر کی نمائندہ تھیں۔

وہ ڈپلومیٹ ہیں۔ ایک سیاست دان نے کسی کو بتایا کہ میں ڈپلومیٹ ہوں تو دوسرا بولا۔ "اچھا' میں تو تمہیں غیر شادی شدہ سمجھتا تھا۔" لیکن اس کے باوجود وہ امریکہ میں کسی کو اپنے گھر دعوت نہیں دیتیں۔ کہتی ہیں یہاں کون سی میری بیوی ہے جو مہمانوں کو کھانا پکا کر کھلائے۔

امریکی گفتگو اور لباس میں اختصار سے کام لیتے ہیں۔ یہ اختصار میں بھی تفصیل سے کام لیتی ہیں۔ انہیں تو بندہ کہہ دے کہ مجھے مونچھیں پسند ہیں تو کہیں گی' مرد کی یا عورت کی۔ جب حکومت ان کی نہیں ہوتی' یہ حکومت کی ہوتی ہیں۔ سیاست میں آنے سے پہلے تصویریں بناتیں۔ سیاست دان اور مصور میں یہ فرق ہے کہ مصور کی صرف تصویروں کو ہی لٹکایا جاتا ہے۔ ان عورتوں سے زیادہ تیز ہیں جو ان سے کم تیز ہیں۔ غصے میں منہ کھلا رکھتی ہیں اور آنکھیں بند۔ وہی باتیں چھپاتی ہیں جو وہ نہیں جانتیں۔ ایسی با رعب

شخصیت ہیں کہ کچھ نہ بھی کہہ رہی ہوں' تب بھی لگتاہے کہ کچھ کہہ رہی ہیں۔

مسز تھیچر سے خاوند کو ان سے ملنے سے پہلے محترمہ کے پی اے سے ٹائم لینا پڑتا ہے۔

ایک بار کسی نے تھیچر کے خاوند سے پوچھا۔ "مارگریٹ تھیچر آپ کی بیوی ہیں؟" تو اس نے کہا۔ "آپ کو اس شے پر کوئی شک ہے؟"

جھنگ کے لوگ انہیں اپنا ہیرو کہتے ہیں۔ سنا ہے کچھ "عزیز" انہیں "چاند" بھی کہتے ہیں' جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ چاند "مذکر" ہوتا ہے۔ بہرحال جب تک وہ سفیر بن کر امریکہ نہیں گئی تھیں' لوگوں کو شک تھا کہ پاکستانی سیاست میں بے نظیر واحد خاتون ہیں' اب شک نہیں رہا۔

○○○

• شگاری

وہ پاکستان کے ویران صوبے کے آباد سرکار ہیں۔ شکل سے بلوچ نہیں' پورا بلوچستان لگتے ہیں۔ مونچھیں اتنی نوکیلی کہ ان سے کسی کو زخمی کیا جا سکتا ہے۔ چیتے کی پھرتی' عقاب کی نظر' اونٹ کی دشمنی اور شیر سی ہلا شیری ہی نہیں' ان میں اور بھی کئی جانوروں والی خوبیاں موجود ہیں۔ وہ بگٹی قبیلے کے سردار ہیں۔ یہ اس قدر جنگجو قبیلہ ہے کہ ان کے ہاں جس دن بچہ باہر کسی کو مار کر نہ آئے' اس دن بچے کو مارتے ہیں۔ لوگ اپنے ذہن میں خدا کا تصور بنانے کے لیے سردار کو دیکھتے ہیں۔ معاف نہ کرنا اور حکم دینا اکبر بگٹی کو ورثے میں ملا ہے۔ دوسرے کی بات یوں سنتے ہیں جیسے بادشاہ کسی کی فریاد سن رہا ہو۔ خود کو اپنے قد سے بھی اونچا سمجھتے ہیں۔ ویسے ان کا قد ایسا ہے کہ بندہ ان کے پاؤں سے سر تک پہنچے تو موسم بدل چکا ہوتا ہے۔

دوران تعلیم کوئی پوچھتا۔ "آپ کس کلاس میں پڑھتے ہیں؟" تو کہتے۔ "اپر کلاس میں" استاد پوچھتا۔ "ہوم ورک کیا ہے؟" تو کہتے "ہمارے ہاں ہوم ورک نوکر کرتے ہیں۔" ہر معاملے میں خود کو دوسرے سے بڑا سمجھتے ہیں۔ وہ تو دس سال کی عمر میں بھی تیس سال کے لوگوں سے خود کو بڑا سمجھتے۔ ایچی سن کالج میں ان کی تعلیم کے دوران جب چیانگ کائی شیک دورے پر آیا تو بچوں کو لائن میں کھڑا کر کے ان سے ہاتھ ملانے کو کہا گیا۔ "جب معزز مہمان موصوف تک پہنچے تو یہ پیٹھ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ اب بھی جب کسی "معزز مہمان" کو آتا دیکھتے ہیں' ایسے ہی کرتے ہیں۔

لمبی بات نہیں کرتے' بات اتنی مختصر ہوتی ہے کہ جونہی دوسرا متوجہ ہوتا ہے' بات ختم ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ اتنی مختصر ہوتی ہے کہ اس کے لیے منہ بھی ہلانا نہیں پڑتا۔ اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے زور سے نہیں بولتے' بلکہ چپ ہو جاتے

ہیں۔ اس قدر صاف گو کہ بچپن میں بھی اس وقت تک کسی نے ان کے منہ سے جھوٹ نہ سنا جب تک وہ باتیں نہ کرنے لگے۔ انگریزی ادب اس قدر پسند ہے کہ جس کا ادب کرنا چاہیں' انگریزی میں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ "انگریزی پر میری گرفت ہے۔" واقعی ان کی انگریزی قابل گرفت ہے۔ سنا ہے جب وہ اردو کے خلاف ہوں تو اردو نہیں بولتے' حالانکہ جب وہ اردو بولتے ہیں تو یہی لگتا ہے کہ وہ اردو کے خلاف ہیں۔

مجلس میں کوئی ایسی گفتگو یا واقعہ نہیں سناتے جس میں ان کی حیثیت ثانوی ہو۔ اس لیے وہ قیام پاکستان پر گفتگو نہیں کرتے۔ وہ تو اپنے بیٹے کی شادی کی تقریب کے دولہا خود ہی ہوتے ہیں۔ وہ کام نہیں کرتے' جو سب کر سکیں۔ وہ کتاب تک نہیں پڑھتے' جسے سب پڑھ سکیں۔ سیاست دانوں میں بیٹھے ہوں تو ان کی آنکھوں میں ایسی مستعدی ہوتی ہے جیسے مچان پر بیٹھے ہوں۔ ان سے پوچھو۔ "کس کا شکار پسند کرتے ہیں؟" تو کہیں گے۔ "شکاری کا" نواب اکبر بگٹی ایک بار نصر اللہ خان سے ناراض ہوئے تو کہا۔

"آپ میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ آپ نوابزادہ ہیں اور میں نواب ہوں۔"

خود کو اپنی جماعت کا حصہ نہیں سمجھتے' جماعت کو اپنا حصہ سمجھتے ہیں۔ وہ کسی جماعت میں کھپ نہیں سکتے۔ جس جماعت میں جائیں' وہاں کھپ پڑ جاتی ہے۔ ہمارے ہاں مخلوط حکومتیں ہی نہیں' حکمران بھی مخلوط ہوتے ہیں لیکن کسی مس کا لیڈ کرنا موصوف کے نزدیک مس لیڈ کرنا ہے۔ حکومت آسان اور حکمرانی مشکل ہے اور وہ حکمرانی کرتے ہیں' حکومت نہیں۔ ہمیشہ اپنا سر اونچا رکھا۔ وہ تو سوتے وقت بھی سر اونچا رکھتے ہیں' چاہے اس کے لیے دو تکیے کیوں نہ استعمال کرنا پڑیں۔ کسی کی تعریف بھی یوں کرتے ہیں جیسے اس کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ بھٹو مرحوم نے انہیں بلوچستان کے تخت پر یوں بٹھایا جیسے ہمارے ہاں چھوٹوں کو پاؤں پر بٹھایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سے پوچھو۔ "دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟" تو وہ کہے گا۔ "ہوتے تو چار ہیں مگر آپ فلاں کنسلٹنٹ سے سیکنڈ اوپینین (Opinion) لے لیں اور فلاں فلاں ٹیسٹ کروا لیں۔" سیاست دان سے پوچھو۔ "دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟" تو وہ کہے گا۔ "آپ کتنے چاہتے ہیں۔" مگر اکبر بگٹی کے علاقے

میں دو اور دو اتنے ہی ہوتے ہیں جتنے موصوف کہیں۔ وہ تو قبیلے کے کسی فرد کو زندہ دفن کرنے کا حکم دیں تو لوگ پھر بھی کہیں گے۔ "دفن تو کیا مگر اتنے رحمدل ہیں کہ مار کر نہیں کیا۔" وہ دونوں ہاتھ جیب میں ڈال کر بھی آپ پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ ذہین و "فتین" اکبر بادشاہ کی آنکھوں میں ماضی کے ذکر سے چمک آ جاتی ہیں' جس سے لگتا ہے اب وہ جوان نہیں ہے۔ ویسے بندہ تب بوڑھا ہوتا ہے جب اسے پتہ چلے کہ پچاس کا ہو گیا' لیکن انہوں نے آج تک خود کو یہ پتہ نہیں چلنے دیا۔

Mathematics اتنی کمزور کہ ایماڈنکن نے ان سے پوچھا۔ "آپ نے اپنے ہاتھوں سے کتنے لوگوں کو قتل کیا؟" تو انہوں نے کہا۔ "مجھے گنتی یاد نہیں۔" ہو سکتا ہے' انہوں نے اس عمر میں قتل کرنے شروع کر دیئے ہوں گے جب ابھی گنتی سیکھنا شروع بھی نہیں کی تھی۔ انہیں موت کے بعد زندگی پر ایمان نہیں۔ ان سے مل لو تو موت سے پہلے زندگی پر بھی ایمان نہیں رہے گا۔ ان میں ایک خوبی وہ بھی ہے جو کسی سیاست دان میں نہیں ہوتی۔ جس میں ہو وہ سیاست دان نہیں' وہ ہے اپنی رائے کے غلط ہونے کا سر عام اعتراف کرنا۔ وہ بزدل سیاست کے بہادر سیاست دان ہیں۔ کہتے ہیں۔ "میں کسی پارٹی میں نہیں آ سکتا۔ مجھ میں کئی سیاسی پارٹیاں آ سکتی ہیں۔" دشمنی میں وہاں تک چلے جاتے ہیں جہاں تک دشمنی جا سکتی ہے۔ کہتے ہیں۔ "میں جو سوچتا ہوں' وہ کرتا ہوں۔" حالانکہ وہ جو کرتے ہیں اس سے تو یہ نہیں لگتا کہ وہ سوچتے ہیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ آپ کی بات سن رہے ہیں یا نہیں' آسان طریقہ ہے۔ اگر آپ ان کا ذکر کر رہے ہیں تو وہ سن رہے ہیں۔ اگر نہیں کر رہے تو وہ بھی نہیں سن رہے۔ سیاست دان تو لوگوں کے مسائل کو وسائل بنا کر جیتے ہیں اور وسائل کو لوگوں کے لیے مسائل بنا دیتے ہیں۔ مگر ان کا ذریعہ روزگار سیاست نہیں۔ ان کے تو قبیلے کے لوگ کبھی روزگار کی تلاش میں کہیں نہیں گئے۔ روزگار ان کی تلاش میں سوئی کے مقام پر آیا۔ یہ Suiside موصوف کی اجازت کے بغیر Suicide ہے۔ ان کی پسندیدہ شخصیت

ہٹلر ہے۔ مگر یہ بات اس طرح بتاتے ہیں جیسے وہ ہٹلر کی پسندیدہ شخصیت ہوں۔ کہتے ہیں' انھوں نے اپنی زندگی میں خود سے بڑا آدمی آج تک نہیں دیکھا۔ واقعی جو ان سے بڑا نکلا' اسے دیکھا بھی نہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی ذات پر پی ایچ ڈی کرتے ہیں۔

کہتے ہیں سو سنسار کی' ایک سردار کی۔ اگرچہ سردار اتنے سیاست میں نہیں ہوتے' جتنے لطیفوں میں ہوتے ہیں۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ سردار کتنا ہی سیانا کیوں نہ ہو' لوگ پھر بھی اسے سردار جی ہی کہہ کر بلاتے ہیں۔ وہ بلوچ ہی نہیں بے لوچ سردار بھی ہیں۔ سیاست میں اپنے بچوں کے والد کو اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں۔

غیر سنجیدگی کا مظاہرہ بڑی سنجیدگی سے کرتے ہیں۔ کسی افواہ پر یقین نہیں کرتے' جب تک سرکاری طور پر اس کی تردید نہ ہو جائے۔ ان کے کئی محافظ ہیں جن کا دعویٰ ہے جب تک موصوف کی زندگی ہے' ہم انہیں مرنے نہیں دیں گے۔ موصوف بے اختیار اپنے اختیار کی بات کرتے ہیں۔ کسی کی تعریف بھی یوں کرتے ہیں جیسے اس کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ کھانوں میں انہیں مرچیں پسند ہیں۔ ان کے کھانے میں مرچیں نہیں ڈالی جاتیں' مرچوں میں کھانا ڈالا جاتا ہے۔ بڑوں میں انہیں چھوٹے پسند ہیں۔ ان کے غسل خانے کے باہر میڈونا کی تصویر دیکھ کر ایماڈنکن نے پوچھا۔ "آپ نے یہ تصویر غسل خانے کے باہر کیوں لگائی؟" کہا۔ "غسل خانے کے اندر گیلی ہو جاتی ہے۔" اس قدر تنہائی پسند کہ قوالی ناپسند ہے کیونکہ اس میں گانے والا تنہا نہیں ہوتا۔ ویسے وہ گانا سنتے ہی نہیں' دیکھتے بھی ہیں۔ گانے والے کو داد یوں دیتے ہیں جیسے تسلی دے رہے ہوں۔ کہتے ہیں بھٹو صاحب میرے کلاس فیلو تھے۔ واقعی بھٹو کا تعلق بھی اسی کلاس سے تھا جس سے ان کا ہے۔ ان کا سیاسی کہنہ سالی کا ذکر کرو تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ کہنہ سالی کہنے پر ناراض تو سالی کو ہونا چاہیے۔ کہتے ہیں یہ فخر کی بات ہے کہ اے کے بروہی مجھے پڑھاتے رہے' مگر کہتے اس انداز سے ہیں جیسے یہ اے کے بروہی کے لیے فخر کی بات ہو۔

جو شخص کچھ نہیں جانتا، مگر سمجھتا ہے، وہ سب جانتا ہے۔ اس کے لیے سیاست بہترین پیشہ ہے۔ موصوف بھی یہی پیشہ کرتے ہیں۔ ہم نے تو ہر کام صفر سے شروع کیا۔ یہاں تک کہ عمر بھی صفر سے شروع کی، لیکن وہ سردار ہیں اور سرداروں کا صفر بھی بارہ سے شروع ہوتا ہے۔ آپ یہ دعویٰ تو کر سکتے ہیں کہ آپ اس کے دوست ہیں مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ آپ کے دوست ہیں۔ اتنا کم سوتے ہیں کہ پوچھو نیند کب آتی ہے؟ تو کہیں گے۔ "جب سویا ہوا ہوں۔"

خوشامد غور سے سنتے ہیں کہ خوشامد کرنے والا دراصل وہی کچھ کہہ رہا ہوتا ہے جو وہ خود کہنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ اتنا وہ نہیں بولتے جتنا ان کی تصویریں بولتی ہیں۔ ویسے مرد خاموش ہو تو آپ اس کی مکمل تصویر نہیں بنا سکتے اور عورت جب تک خاموش نہ ہو، آپ اس کی مکمل تصویر نہیں بنا سکتے۔

وہ مولوی خولیا کے مریض ہیں۔ مذہبی معاملات پر یوں گفتگو کرتے ہیں جیسے لطیفہ سنا رہے ہوں۔ دین کے بارے میں ان کا نظریہ وہی ہے جو شہنشاہ اکبر کا تھا۔ البتہ ان دونوں حکمرانوں میں یہ فرق ہے کہ شہنشاہ اکبر کے پاس نو رتن تھے اور ان کے پاس No رتن ہیں۔

ooo

• بم خان

وہ چپ بھی ہوں تو تب بھی لگتا ہے کہ بول رہے ہیں۔ ایک بار بولیں تو کئی بار سنائی دیتے ہیں۔ لہجہ ایسا کہ کانفرنس کو بھی خانفرنس کہتے ہیں۔ پشتو سے اس قدر محبت کہ انگریزی تک پشتو میں بولتے ہیں۔ بولتے وقت کان' لفظ اور غصہ بہت کھاتے ہیں۔ اگر ان کی بات بہت طویل ہو جائے تو سمجھ لیں وہ اپنی بات کا خلاصہ بیان کر رہے ہیں۔ انہیں اپنی ہر بات پر اس قدر یقین ہوتا ہے کہ خود کو "ولی" کہتے ہیں۔ بات کے اس قدر پکے کہ جو بات آج کہیں گے' بیالیس سال بعد بھی وہی کہیں گے۔ شاید اس لیے آج بھی وہی بات کر رہے ہیں جو بیالیس سال پہلے کیا کرتے تھے۔ وہ تو جو لطیفہ ایک بار سنا دیں' پھر جب بھی لطیفہ سنائیں گے' وہی سنائیں گے۔ ضیاء کے مارشل لاء لگانے پر یہ لطیفہ سناتے کہ ایک شخص گدھے پر چوڑیوں کی گٹھڑی لیے جا رہا تھا۔ ایک سپاہی نے روکا اور ڈنڈا مارتے ہوئے پوچھا۔ "اس میں کیا ہے؟" تو اس شخص نے کہا۔ "اگر آپ نے ایک بار پھر ڈنڈا مارا تو پھر اس میں کچھ نہیں ہے۔" وہ زبان سے سوچتے ہیں۔ اس لیے جب بول رہے ہوں تو سمجھ لیں سوچ رہے ہیں۔ غصے میں بول رہے ہوں تو یہی لگتا ہے فائرنگ کر رہے ہیں۔ سنا ہے وہ غصے میں اپنے علاوہ کسی کی بات نہیں سنتے۔ یہ غلط ہے۔ وہ غصے میں اپنی بھی نہیں سنتے۔

اس خاندان میں آنکھ کھولی' جس نے ابھی تک آنکھ نہیں کھولی۔ جیسے میرا دوست "ف" کہتا ہے' مجھ سے تمیز سے بات کرو میرے سات بھائی ہیں اور ان میں سے ایک کشمیری بھی ہے۔ یہ کہتے ہیں' مجھ سے سیاست کی بات ہوش سے کرو' میرا باپ "گاندھی" بھی رہا ہے۔ پہلے نیشنل عوامی پارٹی کو بیگم نسیم ولی خان سمجھتے' آج کل نسیم ولی خان کو نیشنل عوامی پارٹی سمجھتے ہیں۔ ان کے والد کی اتنی بڑی ناک تھی کہ دھوپ میں انہیں چھتری کی ضرورت نہ پڑتی۔ ناک منہ پر سایہ کئے رکھتی۔ غل خان کی بھی ایسی خوب

ناک ہے کہ وہ ناک کی اوٹ میں چھپ سکتے ہیں۔ ان کی تو چھوٹی انگلی بھی بڑی ہے۔
دونوں باپ بیٹوں میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ یہ کہ باپ عمر میں بڑا تھا۔ ان کے کان
دیکھ کر بندہ سوچتا کہ قدرت کتنی فیوچرسٹک ہے۔ اس نے اس وقت ایسے کان بنانے
شروع کر دیئے جب ابھی انسان کے ذہن میں عینک بنانے کا خیال تک نہ آیا تھا۔
اس عمر میں ہیں جس میں وگ کے بال بھی سفید ہو جاتے ہیں' لیکن بال سفید ہوئے
تو کیا ہوا' عینک تو سیاہ ہے۔ ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں یا اللہ ایسی چشم بینا عطا فرما کہ
دیکھنے کے لیے عینک کی ضرورت نہ پڑے۔ ان کی نظر گاندھی آشرم میں لاٹھی لگنے
سے خراب ہوئی۔ تب سے پاکستان کو اسی خراب نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ کام جو دل
لگا کر کرنے چاہئیں' وہ کام بھی عینک لگا کر کرتے ہیں۔ نہرو جیکٹ پہنتے ہیں' جو اپنی
حالت سے واقعی نہرو کی ہی لگتی ہے۔ طویل عرصہ خان قیوم خان اور آشوب چشم میں
مبتلا رہے۔ تاہم اب بھی صحت کا پوچھو تو کہیں گے۔ "Fit for Fighting" ہوں۔
ویسے بھی جس پٹھان کا لڑنے کو دل نہ چاہے' یقین کر لیں وہ فٹ نہیں ہے۔ ڈاکٹر
کو اپنی آنکھیں دکھا دکھا کر یہ حالت ہو گئی ہے کہ اب تو جو بھی ملے' اسے آنکھیں
دکھانے لگتے ہیں۔ یادداشت کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ یادداشتہ لگتی ہے۔ جب کہ
نسیم ولی خان کا حافظہ تو اتنا کمزور ہے کہ ان کے اپنے بیٹے بھی تھے' سوتیلے بھی مگر
اب ان سے پوچھو کہ سوتیلا کون سا تو کہیں گی "میں بھول گئی ہوں۔"
پاکستان بننے سے پہلے وہ کانگرس کے رکن تھے۔ پاکستان بننے کے بعد کانگرس ان کی
رکن ہے۔ گاندھی جی سے بہت متاثر ہیں۔ گاندھی جی کو غریب رہنے کے لیے بہت
خرچ کرنا پڑتا۔ ایسے ہی انہیں چپ رہنے کے لیے بہت بولنا پڑتا ہے۔ اپنی پارٹی کو
اپنی ذات سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کی پارٹی پر فقرہ کسو تو سمجھتے ہیں کہ ذاتیات پر اتر
آئے ہیں۔ ان کی پارٹی میں کوئی دوسرا آ جائے تو اسے یوں دیکھتے ہیں جیسے گھر میں
کوئی دوسرا آ گیا ہو۔ وہاں تو شیر باز مزاری بھی شیر ہوتا ہے نہ باز' بس مزارعی ہوتا

ہے۔ کسی کو معاف نہیں کرتے۔ انہوں نے تو کبھی خود کو بھی معاف نہیں کیا۔ کبھی کبھی اپنی پارٹی کو سیر کرانے لاہور لاتے ہیں مگر وہ ان کے واپس چارسدہ پہنچنے سے پہلے ہی چارسدہ پہنچ چکی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں۔ "میں تا حکم ثانی محب وطن ہوں۔" اپنی سیاسی اہلیت و اہلیہ کی وجہ سے پاکستان میں اہم مقام رکھتے ہیں اور یہ اہم مقام چارسدہ ہے۔ والد سے سیاست سے زیادہ باغبانی کا شوق ورثے میں ملا۔ وہ تو باغ باغ ہونا سے مراد دو باغ ہونا لیتے ہیں۔ ولی باغ میں رہتے ہیں مگر یوں جیسے باغی باغ میں رہنے والے کو ہی کہتے ہیں۔ وہ کسی مہمان کے سامنے چائے کے ساتھ بسکٹ رکھ دیں تو مہمان کو یقین ہو جاتا ہے کہ یا تو یہ بسکٹ اصلی نہیں یا یہ اصلی "غل خان" نہیں۔ وہ سانپ پر لاٹھی نہیں مارتے' لاٹھی پر سانپ مارتے ہیں۔ تقریر میں ضرب الامثال یوں لگاتے ہیں جیسے امثال کو ضرب لگا رہے ہوں۔ کوئی بات سمجھ نہ آئے تو اس کے لیے نسیم اللغات نہیں' بیگم نسیم کو دیکھتے ہیں۔ ان کی پارٹی کا نصف بہتر ان کی نصف بہتر ہے۔ گفتگو میں "جی" بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ اگر وہ فقرے کے آخر میں جی لگائیں تو سمجھ لیں گھر سے باہر گفتگو کر رہے ہیں۔ گھر میں وہ فقرے سے پہلے جی لگاتے ہیں۔

وہ بیگم نسیم ولی خان کا مردانہ روپ ہیں' لیکن وہ بیگم صاحبہ سے بڑے سیاست دان ہیں۔ پندرہ سولہ سال بڑے ہیں۔ انگلینڈ جا کر جم کر لکھتے ہیں' جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہاں اتنی سردی پڑتی ہے کہ بندہ نہ لکھے' پھر بھی جم جاتا ہے۔ اپنے بھائی عبدالغنی خان کی طرح تخلیقی آدمی ہیں۔ وہ تو تاریخ بھی لکھ رہے ہوں تو لگتا ہے تخلیق کر رہے ہیں۔ البتہ ان کی آپ بیتی کم اور اپنے آپ بیتی زیادہ لگتی ہے۔ جیل میں تنہائی اور فرصت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے خدائی خدمتگار تحریک کے دو حصے مکمل کر لیے اور کہا' جونہی پھر تنہائی اور فرصت میسر آئی' کتاب کا آخری حصہ بھی مکمل کر لوں گا۔ اس اعلان کے بعد کسی حکومت نے انہیں جیل نہیں بھیجا۔ یاد رہے خدائی خدمتگار

اتنی مذہبی پارٹی رہی کہ اس کے سربراہ کا انتخاب براہ راست خدا کے ہاتھ میں ہوتا۔ جس کو سربراہ کی کرسی سے اٹھاتا' خدا ہی اٹھاتا۔

لائبریری اچھی جگہ ہے بس وہاں کتابیں نہ ہوں۔ ویسے کتاب سے رشتہ تب شروع نہیں ہوتا' جب آپ کتاب شروع کرتے ہیں بلکہ تب سے شروع ہوتا ہے جب آپ کتاب ختم کرتے ہیں۔ غل خان کتابوں کے پرانے رشتہ دار ہیں۔ چپل اور چپل کباب پسند ہیں۔ بڑھاپے میں اتنے جوان ہیں' پتہ نہیں جوانی میں کتنے بوڑھے رہے ہوں گے۔ انہیں غصہ بہت آتا ہے۔ کبھی تو اس بات پر غصہ آ جاتا ہے کہ مجھے فلاں بات پر غصہ کیوں نہیں آتا ہے۔ غصہ اتنا غضبناک کہ وہ تو اپنے ہی غصے سے ڈر کر کانپنے لگتے ہیں۔

بقول پیر پگاڑا "ایک تو ولی جو ہوتا ہے گرم ہے اور اوپر سے پٹھان یعنی بہت ہی گرم" قابل کو کابل کہتے ہیں۔ بھٹو انہیں اس لیے ناپسند نہیں کہ اس کی وجہ سے انہیں اندر جانا پڑا بلکہ اس وجہ سے کہ بیگم نسیم کو باہر آنا پڑا۔ تب سے بیگم نسیم ولی خان باہر ہیں اور خان صاحب اندر۔ کہتے ہیں "بھٹو دور میں تقریر پر پابندی تھی۔" حالانکہ یہ درست نہیں' تقریر پر کب پابندی تھی' مقرر پر تھی۔ بھارت سے اس کی زبان میں بات کرتے ہیں جبکہ پاکستان سے پشتو میں بات کرتے ہیں۔ ایک بار حکومت نے انہیں بھارت میں پاکستان کا سفیر بنا کر بھیجنا چاہا تو بھارت کی حکومت نے کہا "آپ کسی پاکستانی کو بھیجیں۔"

ارسطو نے کہا' انسان ایک سیاسی جانور ہے۔ پتہ نہیں یہ بات انہوں نے جانوروں سے ملنے کے بعد کہی یا سیاست دانوں سے۔ تاہم غل خان ایسے سیاست دان نہیں۔ ایک سیاست دان کو پتہ چلا کہ غل خان پان کھاتے ہیں نہ سگریٹ پیتے ہیں' شراب سے دلچسپی ہے نہ شباب سے۔ تو اس نے کہا۔ "آپ نے یہ کچھ کرنا ہی نہیں تو پھر سیاست کیوں کر رہے ہیں؟" ترقی پسند نظریات کی وجہ سے چل رہے ہیں۔ قوم پرست ہیں۔ ہر وقت آہ و افغان کرتے رہتے ہیں۔ وہ بیگم نسیم ولی کے مزاجی خدا ہیں۔ ان کا مزاج اس

پٹھان کی طرح ہے جو ہینگ لے کر آیا اور چلا چلا کر کہتا۔ "اینگ لے لو" جو چپ کر کے گزر جاتا' اسے کچھ نہ کہتا۔ اگر کوئی کہہ دیتا کہ مجھے ہینگ نہیں چاہیے تو خان غصے میں آ کر کہتا۔ "خو تم اینگ کیوں نہیں لیتا' ام تمہارے باپ کا نوکر ہے جو تمہارے واسطے اتنی دور سے اینگ لایا ہے۔"

غل خان لوگوں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھیں نہ رکھیں' جس رگ پر ہاتھ رکھیں وہ ضرور دکھنے لگتی ہے۔ وہ ان سیاست دانوں میں سے ہیں جن کے پاس ہر حل کے لیے ایک ہی مسئلہ ہوتا ہے۔ وہ ہے انا۔ سرحد میں پیدا ہی نہیں ہوئے' سیاست کے لحاظ سے بھی ہمیشہ سرحد پر ہی رہتے ہیں۔ پٹھانوں کا تو محبت کرنے کا اندازہ بھی اپنا ہوتا ہے۔ وہ تو کہتے ہیں۔ "خاناں وہ ہم کو اتنا اچھا لگتا ہے کہ دل چاہتا اسے گولی مار دوں۔" سردی گرمی ہر موسم میں گرم۔ ایک زمانہ تھا وہ لطیفہ بھی سنا رہے ہوتے تو لگتا دھمکی دے رہے ہیں۔ مگر اب یہ حال ہے کہ دھمکی بھی دیں تو لگتا ہے لطیفہ سنا رہے ہیں۔ ہم انہیں لطیفہ تو نہیں کہتے مگر وہ سیاست کے بم خان ہیں۔

○○○

- پکاسو کی بیوہ

پاکستان بننے سے قبل سکھوں کے شہر ننکانہ میں ایک لڑکا ہاتھ میں ڈانگ لیے گزرتا تو ہر طرف سے آوازیں آنے لگتیں۔ "بابا ڈانگ' بابا ڈانگ" یہ بچہ ہر وقت ہاتھ میں ڈانگ اس لیے رکھتا کہ اس کے ددھیال والے اس کی ماں سے اچھا سلوک نہ کرتے۔ اسے اپنی امی سے اتنا پیار تھا کہ جب وہ بڑا ہو کر مصور بنا تو تصویر پر اس نے اپنا جو نام لکھا' اس میں بھی امی آتا تھا۔ وہ تھا "رامی" یہ الگ بات ہے کہ تصویر دیکھ کر لوگوں نے نام کو یوں ادا کرنا شروع کیا کہ احتیاطاً رامی کی بجائے رامے لکھنے لگے۔ وہ اداکار جتندر کے ہم عمر اور بچپن کے ساتھی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کل رامے پچاس سے اوپر ہیں' جبکہ جتندر پچیس سے اوپر کے۔ ویسے بھی اداکار' بیوی اور کار جب پرانی ہو جائے تو چالیس سے اوپر نہیں جاتی۔ بہرحال ان دونوں دوستوں نے اداکاری کے لیے مختلف فیلڈ چنے اور کامیاب رہے۔

والدہ انہیں بچپن میں جھوٹ بولنے سے منع کرتیں۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ بیٹا بڑا ہو کر سیاست دان بنے گا۔ رامے صاحب جب کسی واقعہ پر حیران ہوں تو انہیں چپ لگ جاتی ہے۔ اپنی پیدائش کے تین سال بعد تک نہ بولے۔ چھوٹے تھے تو کئی سال بعد بولنا آیا۔ بڑے ہوئے تو کئی سال چپ ہونا نہ آیا۔ فلسفے میں داخلہ لیا۔ ہر گتھی سلجھا لی۔ جو گتھی سلجھنے کی بجائے الجھنے لگی' اس سے شادی کر لی۔ ماں اور بیوی نے ان کی شخصیت پر ایسا اثر ڈالا کہ آج بھی وہ پچاس فیصد ماں اور پچاس فیصد بیوی ہیں۔ ڈاکٹر مبشر حسن پنجاب کی زنانہ آواز' عابدہ حسین پنجاب کی مردانہ آواز اور رامے صاحب پنجاب کی درمیانہ آواز ہیں۔ جو ان کی آواز ایک بار سن لے' پھر وہ انہیں محترم نہیں' محترمی کہہ کر ہی بلاتا ہے۔

سیاست اور محبت میں جو کرتے ہیں' وہ جائز ہوتا ہے۔ صرف وہ ناجائز ہوتا ہے جو دوسرے

کرتے ہیں۔ پہلے سیاست دان کرپٹ ہوتے تھے' آج کل کرپٹ سیاست دان ہو گئے ہیں۔ رائے خود کو اس سیاست کا باغی کہتے ہیں۔ انہیں مل کر باغی سے مراد باغ میں آنے جانے والا ہی لیا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں میں مڈل کلاس سے ہوں۔ ہم نے سنا ہے' مڈل کلاس سے تو غلام حیدر وائیں صاحب تھے۔ رائے تو ایم اے ہیں۔ اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے مڈل کلاس کی نمائندگی کی ہے تو یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ ہم خود مڈل کلاس کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ مڈل کلاس میں ہم مانیٹر تھے۔

۱۹۵۷ء میں "نصرت" نکالا۔ بعد میں "نصرت" پیپلز پارٹی کا ترجمان بنا۔ اب تو نصرت پیپلز پارٹی کی ترجمان ہیں۔ بھٹو دور میں رسالے "نصرت" پر اپنے نام سے پہلے "طابع" لکھتے مگر اسے "تابع" پڑھتے۔ سولہ ماہ وزیراعلیٰ ہاؤس میں اور سولہ ماہ شاہی قلعے میں قید رہے۔ لوگ ان سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ جب وہ وزیراعلیٰ تھے تو لوگ وزیراعلیٰ ہاؤس کے سامنے جا کر کہتے۔ "وزیراعلیٰ کو رہا کرو" لیکن یہ آج تک یہی سمجھتے ہیں کہ عوام کہتے ہیں۔ "وزیر اعلیٰ رہا کرو" آج بھی نام کے ساتھ وزیر اعلیٰ یوں لکھتے ہیں جیسے ڈاکٹر اپنے نام کے ساتھ ایم بی بی ایس لکھتے ہیں۔

روزنامہ "مساوات" سے نکل کر مساوات پارٹی بنائی۔ دونوں میں یہ فرق تھا کہ روزنامہ "مساوات" کے کارکن زیادہ تھے۔ پارٹی کا اس قدر خیال رکھتے کہ جب کہیں باہر جاتے تو ہمسائیوں کو کہہ کر جاتے کہ اس کا خیال رکھنا' آ کر لے لوں گا۔ ریٹرن ٹکٹ پر سفر کرتے ہیں۔ وہ تو الیکشن میں بھی ریٹرن ٹکٹ پر ہی Suffer کرتے ہیں۔

مصوری فطرت کی عکاس ہوتی ہے۔ جی ہاں' مصور کی فطرت کی۔ پینٹنگ دیکھنے کا اصول یہ ہے' خود نہ بولو' پینٹنگ کو بولنے دو۔ رائے صاحب نے تجریدی مصوری کو بہت توجہ دی۔ ویسے بھی تجریدی مصوری اتنی توجہ مانگتی ہے کہ مصور کا ذرا دھیان ادھر ادھر ہو جائے تو بھول جاتا ہے کہ کیا بنا رہا تھا۔ سکھوں کے شہر میں پیدا ہوئے' مگر اپنی گفتگو سے اس کا پتہ نہیں چلنے دیتے۔ ان کی تصویروں سے پتہ چلتا ہے' بد صورتی کو بڑی خوبصورتی سے پینٹ کرتے ہیں۔ مصوری میں وہ پکاسو کی بیوہ ہیں۔ کسی تصویر کو کپڑے

پہنا دیں تو اس کی طرف یوں دیکھیں گے جیسے کوئی سخی کسی ننگے کو لباس پہنانے کے بعد دیکھتا ہے۔ بچپن میں ٹریس کر کے تصویریں بناتے اور مار کھاتے۔ ہمارے تو ایک جاننے والے مصور نے ٹریس کر کے تصویر بناتے ہوئے بیوی سے مار کھائی کیونکہ وہ ایک ماڈل حسینہ سے تصویر ٹریس کر رہے تھے۔

جہاں بلند بولنا ہو وہاں سرگوشی کریں گے' جہاں سرگوشی کرنا ہو وہاں خاموشی کریں گے۔ انہیں تو ایک آدمی سے بات کرنے کے لیے بھی مائیک چاہیے۔ اس قدر آہستہ بولتے ہیں کہ زور لگا کر سننا پڑتا ہے۔ ان کا چہرہ ایک بار دیکھ لو تو ایک بار ہی یاد رہتا ہے۔ بار بار دیکھو گے تو بار بار بھولے گا۔ انہیں ہر مشکل پسند آتی ہے۔ وہ تو مشکل کو مہ شکل سمجھتے ہیں۔

انہوں نے اپنی آواز کبھی بیوی کے قد سے بلند نہیں ہونے دی۔ ان کی پسندیدہ شخصیت ان کی بیوی کا شوہر ہے۔ ہر بیوی کے جذبات کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ اگر انہیں پتہ ہو کہ مجھے آج مرنا ہے تو وہ سب سے پہلے جو کام کریں گے' وہ یہ ہو گا کہ اپنی بیوی کو تعزیتی کارڈ ارسال کریں گے۔ سکول میں ان کی نرم طبیعت' قوت برداشت اور صبر کی وجہ سے ایک بار سکول ٹیچر نے کہا تھا۔ "یہ مستقبل کا مستقل شوہر ہو گا۔"

آج کل دنیا کی سپر پاور امریکہ ہے۔ رامے صاحب کی "دنیا" کی سپر پاور بھی آج کل ایک امریکن ہی ہے۔

کہتے ہیں اقتدار کا بھولا شام کو پارٹی میں آ جائے تو بھولا نہیں کہلاتا۔ البتہ اگر وہ رات کو پارٹی میں آئے تو اور بات ہو گی۔ انہیں اگر ڈاکٹر کہے کہ آپ کی صحت کے لیے تبدیلی ضروری ہے تو صبح ایک پارٹی بدل لیں گے۔ کہتے ہیں۔ "میں نے زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ دیکھی ہے' وہ سورج ہے۔" واقعی چڑھتے سورج کو ان سے زیادہ کس نے دیکھا ہو گا۔ استاد تھے تو طبیعت میں شاگردی تھی۔ طبیعت میں استادی آئی تو سیاست میں آ گئے۔ انہیں ہر وقت ایک بندہ چاہیے جس کی تعریف کر سکیں۔ اگر کوئی نہ ملے تو شادی کا سوچنے لگتے ہیں۔ کافی اس قدر پسند ہے کہ صرف وہی چیز لیتے ہیں جو

کافی ہو۔ ہم تو کہتے ہیں مشروبات ہیں ہی دو طرح کے۔ ایک کافی اور دوسرے ناکافی۔
صاحب! جس نے کبھی عورت سے محبت نہیں کی' وہ قابل اعتبار نہیں ہو سکتا اور جس

نے عورت ہی سے محبت کی۔ وہ بھی قابل اعتبار نہیں ہوتا۔ ادب نے ان کا قد بحیثیت
سیاست دان کم کیا اور سیاست نے ان کا قد بحیثیت ادیب کم کیا۔ کہتے ہیں' میری
تحریروں میں علم و فضل کی کمی نظر آئے تو ادیب سمجھ کر معاف کر دیں۔

محمد حنیف رامے وہ تصویر ہیں جو انہوں نے خود بنائی ہے۔ کبھی انہوں نے اسے ایک سیاست
دان وزیراعلیٰ کی شکل دی' کبھی ترقی پسند صحافی کی کبھی "پنجاب کا مقدمہ" لڑنے والے
ادیب کی' کبھی مقرر اور کبھی دانشور کا روپ دیا اور کبھی ان سب پر خط تنسیخ پھیر
کر ہاتھ میں برش پکڑ کر خود تصویر کی جگہ آ کھڑے ہوئے۔ یہ وہی بابا ڈانگ ہے جو
خود تو وہی کا وہی رہا مگر اس کی ڈانگ گھستے گھستے قلم اور برش ہو گئی۔

ooo

- # عروس العلماء

دیکھنے میں ناصح' کہنے میں ناتخ۔ غصے میں نیازی اور اگر آپ غصے میں ہوں تو جنرل نیازی۔
حیات محمد خان کوثر نیازی کا پہلا ہاف میانوالی میں پیدا ہوا اور دوسرے نے لاہور میں جنم لیا۔ وہ میاں والی کے میاں نہ بن سکے نہ والی' اور لاہور تو ہے ہی لا...ہور مگر میاں والی کے حیات محمد لاہور کی کوثر بن گئے۔ اداکاراؤں کے لیے حوض کوثر اور علماء کے استفادے کے لیے خوض کوثر۔ حیاتی' حیات محمد کی مونث و مونس رہی۔ جماعت نے کوثر کو مولانا کے پیچھے لگایا اور مولانا کوثر نیازی بنا دیا۔
بچپن میں ایسی حرکتیں کرتا کہ دیکھنے والا کہہ اٹھتا۔ "وا حیات" کلاس میں ٹیچر سوال پوچھتا تو یہ سب سے پہلے ہاتھ کھڑا کرتے اور جب تک فارغ ہو کر آتے' سوال کا جواب دیا جا چکا ہوتا۔ بچپن ہی سے مذہب اور میٹھے سے لگاؤ تھا۔ ویسے اگر کوئی مولوی کہے' مجھے میٹھا ناپسند ہے تو سمجھ لیں یہ جھوٹ ہے۔ اگر وہ سچ بول رہا ہے تو پھر یہ جھوٹ ہے کہ وہ مولوی ہے۔ پڑھنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پڑھانے لگو۔ سو یہ سکول ٹیچر ہو گئے۔ بچپن ہی سے بارلیش اور بارش بھاتی۔ حیات محمد کو "کوثر" رسالے نے نام دیا۔ Weakly "کوثر" نہ چلا مگر Weakly کوثر چل نکلے۔ پھر "شہاب" کے بانی ایڈیٹر ہوئے مگر شہاب آؤٹ ہونے سے ایک دن پہلے ہی آؤٹ ہو جاتے۔ شہاب ایسا پرچہ تھا جس پر پرچہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس رسالے کو پڑھنے کے لیے بڑا سمجھدار ہونا ضروری تھا۔ جو اس معیار پر پورا نہ اترتا' وہ اسے پڑھ تو نہ سکتا' اس میں لکھ سکتا تھا۔
وہ جیسے سیاستدان ہیں' ایسے ہی ادیب ہیں اور جیسے ادیب ہیں' ویسے ہی سیاست دان۔ ان لوگوں سے زیادہ عالم ہیں جو ان سے کم عالم ہیں۔ جتنا انہوں نے لکھا' ہمارے ہاں اتنا کاتب لکھتے ہیں۔ وہ صرف کاتب ہی سے ڈرتے ہیں کیونکہ کاتب تقدیر کے بعد کاتب تحریر ہی جنس بدل سکتاہے۔ ایک بار کاتب نے انہیں نامزد امیدوار لکھا مگر "ز" کا نقطہ

نہ ہونے کی وجہ سے ان کی بڑی "نکاتی" ہوئی۔

انہوں نے تین درجن کتابیں لکھیں۔ ویسے بھی ان کی کتابیں اتنی بڑی بڑی ہوتی ہیں کہ آٹھ کتابوں میں ہی درجن پوری ہو جاتی ہے۔ ان کی کتابیں پڑھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے' خاص کر کے اس وقت جب وہ ختم ہوتی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو پر لکھی ان کی کتاب "دیدہ ور" پر کسی نقاد نے کہا کہ آج ایسی کتابیں ایک سو دس روپے میں بک رہی ہیں' اچھے وقتوں میں اتنی قیمت میں ساتھ مصنف بھی خریدا جا سکتا تھا۔ صدیق سالک کی کتاب "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا" کے بارے میں کسی نے کہا تھا کہ اس کا نام "میں نے ڈھاکہ ڈبوتے دیکھا" ہونا چاہیے تھا۔ ایسے ہی مولانا کی کتاب "اور لائن کٹ گئی" کا نام ہونا چاہیے تھا "اور لائن کاٹ دی"

"زر گل" اور "لمحے" دو شعری مجموعے ہیں جن کے باہر لکھا ہوتا ہے کہ یہ شعری مجموعے ہیں تا کہ پڑھنے والے کو پتہ چل سکے کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ ادبی تقریبات کے صدور والی ان میں تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں' یعنی سوتے ہوئے خراٹے نہیں لیتا۔ کوثر وہ شاعر ہیں جن کی وجہ سے ایک گھر میں طلاق ہو گئی۔ ایک میاں روز اپنی بیوی سے کہتے۔ "مجھے کوثر کا یہ شعر پسند ہے' وہ شعر پسند ہے۔" بیوی نے تنگ آ کر کہا۔ "اگر تمہیں کوثر اتنی ہی اچھی لگتی ہے تو اسے لے آؤ۔ میں چلی۔"

مولانا نے ساری عمر نثر بولی۔ سوانح عمری لکھنا چاہ رہے تھے۔ مغرب میں جو رائٹر فکشن لکھنا چاہے' وہ ناول یا افسانہ لکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس کام کے لیے سوانح عمری لکھتے ہیں۔ ان کی صلاحیتیں دیکھ کر یہ نہیں لگتا کہ دریا کو کوزے میں سمیٹا گیا ہے' لگتا ہے کوزے کو دریا میں سمیٹا گیا ہے۔ کسی شاعر کا کلام سنائیں تو لگتا ہے' اپنا کلام سنا رہے ہیں اور اپنا کلام سنائیں تو لگتا ہے کسی اور کا سنا رہے ہیں۔

بول رہے ہوں تو ایک صحافی نہیں لگتے' دو لگتے ہیں۔ ایسے مقرر کہ لگتا ہے اسی کام کے لیے مقرر ہیں۔ وہ تو شعر بھی سنائیں تو لوگ مکرر نہیں کہتے' مقرر کہتے ہیں۔ جیسے

کارٹونسٹ فیکا کارٹون بناتے بناتے اس مقام پر آ گیا ہے کہ یونہی لکیریں کھینچے تو کارٹون بن جاتا ہے بلکہ بندہ تو اس کی تصویر کھینچے تو کارٹون بن جاتا ہے۔ ایسے ہی مولانا دیکھنے میں بھی آواز لگتے ہیں۔ چپ ہوں تب بھی سنائی دیتے ہیں۔ انہوں نے گلے کے زور پر سیاست کی۔ ان سے قبل غلے کے زور پر سیاست ہوتی۔ ویسے ہم نے آج تک جس کو متاثر کیا' خاموش رہ کر کیا اور دوسرا اس وقت تک متاثر رہا جب تک ہم خاموش رہے۔ یہ غلط ہے کہ مولانا جب بولتے ہیں تو سنتے نہیں۔ حالانکہ وہ تو بولتے ہی تب ہیں' جب سننا ہو۔ تقریر محبت کی طرح ہوتی ہے۔ اسے ہر بیوقوف شروع تو کر سکتا ہے مگر اختتام تک نہیں لے جا سکتا۔ کچھ ہی بیوقوف اختتام تک پہنچاتے ہیں۔ وہ برنارڈشا کی طرح فی البدیہہ مقرر ہیں اور برنارڈشا کہتا ہے' میں دنیا کے چند فی البدیہہ بولنے والے مقرروں میں سے ایک ہوں' کیونکہ میں نے فی البدیہہ بولنے کی ریہرسل کی ہوتی ہے۔ مولانا تو یہ بتانے میں آدھ گھنٹہ لگا دیں گے کہ بس ایک منٹ بولوں گا۔

دوسروں کے دکھ سکھ میں ایسے شریک ہوتے ہیں کہ آپ کی شادی پر یوں شاد ہوں گے کہ نئے آنے والے کو پوچھنا پڑے گا کہ شادی کس کی ہے۔ ایسے خطیب کہ جو کہتے ہیں' اس کی تصویر کھینچ کے رکھ دیتے ہیں۔ جہنم کا ذکر کر رہے ہوں تو لگتا ہے' آنکھوں دیکھا حال نشر کر رہے ہیں۔ ٹی وی پر مبلغ تین سو روپے میں مبلغ بنتے رہے۔

ہر پارٹی میں چلے جاتے ہیں' بشرطیکہ پارٹی کے منشور میں کھانا ہو۔ وہ اکیلے بھی کھا رہے ہوں تو لگتا ہے' پارٹی کھا رہی ہے۔ مغز بہت کھاتے ہیں۔ یوں ان کے پیٹ میں بھی مغز ہے۔ ایک بار ان کو کھاتا دیکھ کر کسی نے لکھ دیا کہ یوں کھاتے ہیں' جیسے پہلی بار کھا رہے ہوں۔ ویسے وہ اس کی دوا بھی لیتے رہے ہیں کہ کھانا کھانے سے بھوک نہیں لگتی۔ پوچھو "کھانوں میں زیادہ کیا پسند ہے؟" تو کہیں گے۔ "زیادہ کھانا پسند ہے۔" کھانے والی چیزوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑتے ہیں۔ کھانے کا اس قدر شوق کہ کسی کی بات پسند آئے تو کہیں گے۔ "بڑی لذیذ بات ہے۔"

جسے دور کرنا چاہیں' اس کے قریب ہو جاتے ہیں۔ لوگ انہیں مولانا کوثر نیازی بھی کہتے ہیں۔ پیر پگاڑا صاحب نے کہا ہے۔ "مولانا کوثر نیازی اتنے ہی مولانا ہیں' جتنے ہم پیر ہیں اور ہم اتنے ہی پیر ہیں جتنے وہ مولانا ہیں۔" وہ سیاست میں بعد میں آئے' پہلے ان میں سیاست آئی۔ ان میں اتنی انٹیلی جنس ہے' جتنی انٹیلی جنس والوں میں ہوتی ہے۔

شورش کاشمیری کے بقول "بھٹو کی مردم شناسی دیکھئے' اطلاعات بہم پہنچانے والے کو انہوں نے مشیر اطلاعات بنا دیا۔"

تاریخ کا علم رکھتے ہیں۔ ہم تو تاریخ کا علم اس لیے نہیں رکھتے کہ وہ بڑی جلدی بدلتی ہے۔ آج دس تاریخ ہے تو کل گیارہ ہو گی۔ مولانا تاریخ ساز شخصیت ہیں۔ چاہیں تو رانی جھانسی کو رانی جھانسہ بنا دیں۔ ذہین و فتین مولانا کے کلام میں بڑی فسادت و بلوغت ہے۔ فطرت پسند ہے۔ جی ہاں' اپنی فطرت پسند ہے۔ انہوں نے ڈبل لائف گزاری۔ ویسے تو ہمارے ہاں اکثر لوگ ڈبل لائف ہی گزارتے ہیں۔ ایک اپنی اور ایک اپنی بیوی کی۔

فلمی سنسر بورڈ میں تھے کہ کوئی سین سنسر کرنے کا فیصلہ کرنے سے پہلے یقین کر لیتے کہ یہ سین فحش ہے اور اس وقت تک سین بار بار دیکھتے جب تک یقین نہ ہو جاتا کہ سین فحش ہے' لیکن اس قدر باحیا کہ اس سین کو ساتویں بار دیکھ کر بھی ان کے کان اتنے ہی سرخ ہوتے' جتنے پہلی بار دیکھ کر ہوتے۔ ان دنوں اداکاراؤں کے ساتھ جتنی ان کی تصویریں چھپتیں' اتنی تو ان اداکاراؤں کی اپنے خاوندوں کے ساتھ نہ چھپی ہوں گی۔ تصویروں میں اکثر اداکارائیں ان کا سانس روکے کھڑی ہوتیں۔

اسلام سے اس قدر محبت ہے کہ ہر کام اسلام کو آباد دیکھنے بلکہ اسلام آباد کو دیکھنے کے لیے کیا۔ یہ علم کا وہ چشمہ ہیں جس میں حکمران غرارے کرتے رہے۔ غرارے انہیں بھی پسند ہیں' بشرطیکہ پہننے والے پسند کے ہوں۔ مہمان اچھے ہیں اور اچھا مہمان وہ ہوتا ہے جو میزبان سے کہے کہ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔ بھٹو دور میں ڈاکٹر نے بیٹھے سے

منع کیا تو خوشی کے موقع پر یہ کہنے کی بجائے کہ منہ میٹھا کرواؤ' کہا کرتے۔ "منہ کڑوا کرواؤ۔"

بغیر سوچے سمجھے بات نہیں کرتے۔ کیونکہ بغیر سوچ سمجھے بات کرنے سے بعد میں پریشانی ہوتی ہے' حالانکہ سوچ سمجھ کر بات کرنے سے پہلے پریشانی ہوتی ہے۔ زندگی میں پہلی بار جو کتاب لائبریری سے پڑھی' وہ سکھوں کے گرو نانک کے بارے میں تھی۔ اس سے بہت متاثر ہیں مگر جب تک غصے میں نہ ہوں' اس کا پتہ نہیں چلنے دیتے۔ ان کی ذاتی لائبریری اتنی بڑی ہے کہ وہاں کتاب ڈھونڈنے میں اتنی ہی دیر لگتی ہے جتنی پورے لاہور سے ڈھونڈنے میں لگتی ہے۔ کہتے ہیں' میں صرف معیاری کتابیں پڑھتا ہوں۔ ٹھیک کہتے ہیں ہم نے کبھی انہیں اپنی لکھی ہوئی کتابیں پڑھتے نہیں دیکھا۔ ۱۹۷۰ء میں جیل ہی میں قومی اسمبلی کے ممبر چنے گئے تو کسی سے کہا۔ "دیکھا' حالانکہ میں بند تھا اور لوگوں سے مل نہ سکتا تھا۔" تو سننے والے نے کہا۔ "اسی لیے تو جیت گئے۔"

میاں طفیل محمد کے طفیل پتہ چلا کہ جب کوثر نیازی جماعت اسلامی میں تھے تو ایوب خان کے ساتھ تھے۔ جب ایوب خان کے پاس تھے تو بھٹو کے ساتھ تھے اور جب بھٹو کے ساتھ تھے تو پتہ نہیں اندر سے کس کے ساتھ تھے۔ بہرحال مولانا وہ شخص ہیں جو ان پر پہلی بار بھی یقین کر رہا ہوتا ہے' وہ بھی دراصل آخری بار کر رہا ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم سمجھتے ہیں' مولانا کوثر نیازی نے کسی سے بیوفائی نہیں کی ہے۔ انہوں نے صرف ایک شخص سے بیوفائی کی ہے اور اس کا نام ہے ------- "مولانا کوثر نیازی"

ooo

- ملا دو پلازہ

جس مولوی کا پیٹ بڑا نہ ہو' اس کے مولوی ہونے پر شک ہونے لگتا ہے کہ لوگ تو مولوی کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں' مگر مولوی اپنے پیٹ کے پیچھے پڑھتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن دیکھنے میں مولوی لگتے ہیں' یعنی پیدل بندہ ان کی شلوار میں نالا نہیں ڈال سکتا۔

یہ سپر ہیوی ویٹ مولانا سیاست میں لائیٹ ویٹ مولانا ثابت ہوئے۔ ان کی پالیسیاں اتنی دھندلی ہوتی ہیں کہ پارٹی ورکروں کو بھی نظر کی عینک لگا کے دیکھنا پڑتی ہیں۔ ان کی پارٹی ایسی ہے کہ جس پارٹی کے ساتھ ہو' اسے بھی پتہ نہیں ہوتا بلکہ خود مولانا کو اخبار کے دفتر فون کر کے پوچھنا پڑتا ہے کہ آج ہم کس کے ساتھ ہیں؟

وہ جمعہ کے روز جمعیت العلمائے اسلام کے گھر اس وقت پیدا ہوئے' جب گھر والے جمعہ کی نماز پڑھنے گئے تھے۔ وہ جب پیدا ہوئے تب بھی مولانا تھے۔ عین جوانی میں بوڑھے ہوئے اور ۲۶ سال کی عمر میں ۶۲ سالہ ناظم اعلیٰ بنے۔ مولانا مفتی محمود نے آدھی عمر اللہ سے "فضل" مانگا اور باقی آدھی عمر اس کی صحت دیکھ کر کہا۔ "میرے گھر میں اللہ کا بڑا فضل ہے۔" مفتی صاحب کے انتقال کے بعد جمعیت علمائے اسلام کا انتقال مولانا فضل الرحمٰن کے نام ہو گیا۔ پارٹی ورکروں نے انہیں یوں مانا جیسے مفتی صاحب کا فتویٰ مان رہے ہوں۔ مولانا سیاست میں بڑے باپ کی حیثیت سے داخل ہوئے اور ابھی تک ان کی یہی حیثیت ہے۔ وہ اس سے کم عمر کے بیٹے ہیں جس کی عمر کے وہ نظر آتے ہیں اور اس سے زیادہ عمر کے ہیں جس عمر کے اپنے بیانوں سے لگتے ہیں۔ وہ جمعیت کے امیر اور سیاست کے غریب ہیں۔ سیاست میں کسی سے اتنی دشمنی نہیں رکھتے کہ اس سے دوستی نہ ہو سکے اور کسی سے اتنی دوستی نہیں رکھتے کہ اس سے دشمنی ہو سکے۔ کوئی بات خلاف مرضی ہو تو ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے' حالانکہ پٹھان ہیں اور پٹھانوں کی مرضی کے خلاف بات کی جائے تو چہرہ ضرور سرخ ہوتا ہے' مگر بات کرنے

والے کا۔ دوستوں کا پتہ نہیں' البتہ ان کا لباس چند ہی دنوں میں تنگ آ جاتا ہے۔ شلوار قمیض تو ایک طرف انہیں تو دھوتی کرتہ تنگ ہو جاتا ہے۔ ان کا عرض بڑا طول ہے۔ ہمیشہ سفید لباس پہنتے ہیں۔ "ف" کہتا ہے' یہ کونسی بڑی بات ہے۔ میں بھی جب لباس پہنتا ہوں تو وہ سفید ہی ہوتا ہے۔ ایک رومال کاندھے پر اور ایک سر پر باندھتے ہیں۔ تبدیلی چاہیں تو سر کے رومال کو کاندھے پر رکھ لیتے ہیں اور کاندھے والا سر پر باندھ لیتے ہیں۔ کسی عورت کو ننگے سر دیکھنا تو دور کی بات ہے' آج تک کسی عورت نے انہیں ننگے سر نہیں دیکھا۔

سنا ہے مولانا فٹ بال نہیں کھیل سکتے کہ جہاں فٹ بال رکھ کر ہٹ لگا سکیں' وہاں فٹ بال ہو تو نظر نہیں آتا اور جہاں سے فٹ بال نظر آتا ہے وہاں سے وہ ہٹ نہیں لگا سکتے۔ ہری پور جیل میں ان کا ساٹھ پاؤنڈ وزن کم ہوا تو انہوں نے خدا کا لاکھ شکر ادا کیا۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے' انہوں نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ جیل جاتے وقت ساٹھ پاؤنڈ کا نہیں تھا' ورنہ جیل سے باہر کیا نکلتا؟ اگرچہ منہ سے نکلی بات اور پیٹی سے نکلا پیٹ واپس نہیں آتا' پھر بھی وہ جیل جا رہے ہوں تو سمجھتے ہیں' سلمنگ سنٹر جا رہا ہوں۔ کہتے ہیں پیاز کھانے سے بھی دوست اور وزن کم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے ایک نشست میں کئی بیٹھکیں لگاتے' اب ایک بیٹھک کئی نشستوں میں لگاتے ہیں۔ پسندیدہ کھانا ثرید ہے کہ یہ وہ کھانا ہے جسے کھانے والا مولوی ہو تو کھانا نہیں بچتا اور اگر مولوی نہ ہو تو کھانے والا نہیں بچتا۔ مولانا جو کھاتے ہیں وہ سب کے سامنے ہوتا ہے بلکہ وہ تو جو کھا چکے ہوتے ہیں' وہ بھی سب کے سامنے ہوتا ہے۔ کہتے ہیں چائے سے انکار کفر ہے۔ اس لیے چائے کی دعوت قبول کر رہے ہوں تو لگتا ہے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مہمان نواز ہیں۔ جو چند گھڑیوں کے لیے ان کا مہمان ہو' اسے یوں دیکھتے ہیں جیسے وہ چند گھڑیوں کا مہمان ہو۔ کسی مہمان کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیتے۔ ایک بار مولانا درخواستی انہیں ملنے آئے تو ان کے پاس انہیں دینے کو کچھ نہ تھا۔ سو آدھی

جمعیت علمائے اسلام دے دی۔ البتہ محترمہ بے نظیر بھٹو ان کے گھر آئیں تو محترمہ کو وہ تحفہ دیا جو محترمہ نے آج تک سنبھال کے رکھا ہے۔ انہوں نے محترمہ کو دوپٹہ دیا تھا۔ مولانا کو میٹھے میں میٹھا رنگ پسند ہے۔

صوبہ سرحد کا مزاج ایسا ہے کہ وہاں بندہ اپنے کمرے سے بیوی کے کمرے میں جائے تو بھی صندوق لے کر جاتا ہے۔ مگر مولانا مسلح محافظوں کی بجائے مصلیٰ محافظوں کے ساتھ پھرتے ہیں۔ وہ کلاشنکوف سے زیادہ کیمرے سے ڈرتے ہیں۔ جیل میں پڑھنے لکھنے کا کام کرتے ہیں۔ اس لیے جیل یوں جاتے ہیں جیسے لائبریری جا رہے ہوں۔ فرماتے ہیں۔ "مجھے زندگی میں پھل' پھول' رنگ اور خوشبو ایسی چیزوں پر غور کرنے کا وقت نہیں ملا۔" انہوں نے جس گھر میں آنکھ کھولی وہ مذہب اور سیاست کی یونیورسٹی تھا۔ والد محترم مفتی محمود صاحب نے اپنی زندگی میں انہیں سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہونے سے منع کیا' جس سے اندازہ لگائیں کہ وہ کتنے دور اندیش تھے۔ کہتے ہیں دیکھنے میں وہ مفتی محمود سے جتنی مماثلت رکھتے ہیں' اتنی مماثلت اپنے آپ سے نہیں رکھتے۔ انہوں نے جمعیت علمائے اسلام اور گاڑی چلانا خود ہی سیکھا۔ صلاحیتیں اور انداز سیاست ایسا ہے کہ انہیں کے بقول مارشل لاء حکومت کو اس بات کی جرات ہی نہ ہو سکی کہ مجھے وزارت کی پیشکش کرتی۔ ممکن ہے' مارشل لاء والے ڈرتے پیشکش نہ کرتے ہوں کہ کہیں یہ قبول ہی نہ کر لیں۔

ادب سے اتنا لگاؤ ہے کہ "نظم" کا پوچھو تو کہیں گے' آج کل میں چلا رہا ہوں۔ اس قدر رحم دل ہیں کہ جب کار چلانے لگیں تو ساتھ بیٹھنے والے سے پوچھ لیتے ہیں کہ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے تو نہیں۔ من کی بات سب کو بتا دیتے ہیں' بات من سے کم کی ہو' تب بھی سب کو بتا دیتے ہیں۔ ان کی ہلکی پھلکی باتوں میں بھی بڑا وزن ہوتا ہے۔ اپنے ساتھیوں کو ہر بات بتا کر چلتے ہیں۔ وہ تو لطیفہ سنانے سے پہلے بتا دیتے ہیں کہ یہ لطیفہ ہے تا کہ سننے والوں کو پتہ ہو۔ زیادہ بولتے ہیں نہ کم۔ اتنا دیکھتے نہیں جتنا دکھتے ہیں۔ بات سنجیدہ کرتے ہیں مگر مزاحیہ انداز میں' جبکہ سیاستدانوں کا انداز

سنجیدہ ہوتا ہے' بات مزاحیہ۔ وہ عورت کو آدھا سمجھتے ہیں۔ اس لیے اپنی گھریلو زندگی میں اسے پورا کیا۔ ان سے کوئی پوچھے کہ آپ نے دوسری شادی کرنے کے لیے کیا کیا؟ تو یہی کہیں گے۔ "اس کے لیے پہلی شادی کی۔" رمضان واحد مہینہ ہے جس میں وہ گھر پہ رہتے ہیں۔ اس لیے گھر میں ان کے قیام کو تیسرا دن ہو جائے تو گھر والے سحری کا انتظام کرنے لگتے ہیں۔ وہ سیاست میں کئی آدمیوں پر بھاری ہوں نہ ہوں' وہ کئی آدمیوں سے بھاری ضرور ہیں۔ انہیں کرسی کا کوئی لالچ نہیں کیونکہ ان کے ہاں سب کچھ فرشی نشستوں پر ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے والد کے کام کو ترقی دی۔ وہ ایک پارٹی چھوڑ کر گئے تھے' انھوں نے اسے ترقی دے کر دو بنائیں۔ وہ دنیا سے زیادہ دین کا علم رکھتے ہیں۔ ان کی سیاست بھی ایسی ہے کہ اس کا اجر اگلی دنیا میں ہی ملے تو ملے۔ وہ بنیادی طور پر ایک مدرس ہیں اور جمعیت علمائے اسلام کو یوں چلا رہے ہیں جیسے مدرسہ چلا رہے ہوں۔ سیاست میں ان کو وہی مقام حاصل ہے جو فلموں میں مسرت شاہین کو۔ مذہب کے یہ ملا دو پیازہ سیاست کے ملا دو پلازہ ہیں۔

○○○

• مس پریشانی

عورت اچھی حکمران ہوتی ہے کیونکہ اس کا حکومت کرنے کا بڑا تجربہ ہوتا ہے۔ شاید ہی کوئی خاتون ایسی ہو جس نے کسی پر حکومت نہ کی ہو۔ اس کے باوجود پاکستان جیسے ملک میں اب خاتون وزیراعظم صرف اسی صورت میں کہلا سکتی ہے کہ اس کا نام وزیر بی بی ہو اور وہ کسی اعظم نامی شخص سے شادی کر لے۔ لیکن مس پریشانی وہ واحد خاتون ہیں جو پاکستان کی وزیراعظم رہیں۔ دنیا انہیں میڈیم ڈیمو کریسی کے نام سے جانتی ہے۔ اس لیے انہیں کھانسی بھی لگ جائے تو ہمیں جمہوریت کے خلاف سازش لگتی ہے۔ محترمہ میں دو بڑی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے آج وہ بین الاقوامی قد کی لیڈر ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی ہے اور دوسری بھی یہی ہے۔ ان کا نام بے نظیر نہ ہوتا' تب بھی لوگ انہیں یہی کہتے۔ جیسے اصغر خان کا نام یہ نہ ہوتا' تب بھی وہ سیاست میں اصغر ہی ہوتے۔

سر شاہنواز بھٹو مس پریشانی کے نرم دل دادا اور سیاست کے سخت دلدادہ تھے۔ بچپن میں بھی محترمہ گول میز کانفرنس اور سمٹ کانفرنس کے نتائج یوں سنتیں جیسے ان کے ہم عمر ورلڈ کپ کرکٹ کی سکور سنتے۔ تعلق اس خاندان سے تھا جہاں بچے سونے کے برتنوں میں کھانا کھاتے رہے ہیں۔ بچپن میں اگر محترمہ سے پوچھا جاتا کہ غریب آدمی کے متعلق آپ کیا جانتی ہیں تو یہیں کہتیں کہ غریب وہ ہوتا ہے جس کی کوٹھی میں سب غریب ہوں۔ اس کی کار کا ڈرائیور' اس کے ملازمین' اس کے کارخانے کا چوکیدار غرضیکہ اس کا ہر بندہ غریب ہو۔ بچپن میں رنگ ایسا تھا کہ سرخ گلاب کے پھولوں میں چلی جاتیں تو گھر والوں کو ڈھونڈنے میں مشکل ہوتی۔ آواز قد سے بھی بلند۔ ان کی تو سرگوشی ایسی کہ میلوں تک سنائی دے۔

پیٹر گلبرتھ کے بقول "محترمہ نے ریڈ کلف سے بی اے' آکسفورڈ سے ایم اے لیکن پی ایچ ڈی سکھر جیل سے کی۔" سولہ برس کی عمر میں جب وہ ریڈ کلف گئیں تو اپنی عمر سے بہت چھوٹی تھیں' مگر باپ کی پھانسی کی ایک رات نے پچیس سالہ بچی کو کئی سال بڑا کر دیا۔ ان کا پچیسواں سال مشکل سے گزرا۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے' یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میری بیوی نے بھی پچیسواں سال بڑی مشکل سے کہیں جا کے سات آٹھ سال میں گزارا۔ وہ بچی تھیں تو بھائیوں کا بڑا بھائی بننا پڑا۔ جوان ہوئیں تو والد بننا پڑا۔ شادی ہوئی تو خاوند بننا پڑا۔ اتنی پریشانیاں دیکھیں کہ اب جس دن پریشانی نہ دیکھنا چاہیں' آئینہ نہیں دیکھتیں۔

کوئی پوچھے کہ اس دنیا میں ایک سیاست دان سے زیادہ ناقابل اعتبار آدمی کوئی ہے؟ تو یقیناً اس کا جواب یہی ہو گا کہ دو سیاست دان۔ مگر وہ واحد سیاست دان ہیں جن سے کوئی امید ہو سکتی ہے' ویسے بھی وہی امید سے ہو سکتی ہیں۔ محترمہ ذوالفقار علی بھٹو سے کئی لحاظ سے برتر ہیں۔ ایک تو یہ کہ ذوالفقار علی بھٹو کا والد اتنا بڑا لیڈر نہ تھا جتنا بڑا محترمہ کا باپ تھا۔ محترمہ نے سیاسی سفر کا آغاز گھر سے نہیں' جیل سے کیا۔ اگرچہ ان کے ہاں جیل کا آغاز بھی گھر سے ہوتا ہے۔ محترمہ اپنے والد کے ادھورے مقاصد کی تکمیل کے لیے اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہیں اور ان مقاصد میں سے ایک اقتدار حاصل کرنا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو پورے وزیراعظم تھے' ملک آدھا تھا۔ گواہی کے حساب سے یہ وزیراعظم بھی آدھی ہی تھیں۔ ان کا نعرہ ہے ------ اسلام ہمارا دین' سوشلزم ہمارا الہ دین اور جمہوریت ہماری دین ہے۔ بھٹو مرحوم سے کسی نے کہا تھا کہ آپ جاگیرداری نظام کیا ختم کریں گے' پہلے اپنی زمینیں تو غریبوں میں تقسیم کریں۔ بھٹو صاحب نے یہ سن کر کہا کہ میری زمینیں تو اتنی ہیں کہ ان کو پاکستان کے غریبوں میں بانٹا جائے تو ہر فرد کے حصے میں صرف پندرہ پیسے آئیں گے۔ یہ لو اپنے حصے کے پندرہ پیسے اور آرام

سے بیٹھ جاؤ۔ محترمہ کو بھٹو عزم تو نہ ملا‘ بھٹو ازم مل گیا۔ بھٹو صاحب صرف ایک ولی کو مانتے تھے‘ وہ تھا میکاولی۔ وہ اکثر دوروں پر محترمہ کو ساتھ رکھتے۔ شملہ معاہدے پر بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ جب معاہدہ پر دستخط ہوں تو بے نظیر موجود ہو۔ وفد کے ارکان نے کامیابی اور ناکامی کا کوڈ مقرر کر رکھا تھا کہ اگر ناکام ہوئے تو کہیں گے لڑکی ہوئی ورنہ لڑکا۔ سو جب رات ساڑھے بارہ بجے ارکان "لڑکا ہوا ہے" کہتے ہوئے محترمہ کے کمرے کی طرف آئے اور سامنے محترمہ کو دیکھا تو کہا۔ "لڑکا ..... ہوئی ہے۔"

کہتے ہیں خدا نے مرد کو پہلے بنایا‘ پھر عورت کو پیدا کیا۔ عورت کو پہلے اس لیے پیدا نہ کیا گیا کہ خدا آدم کو کسی کے مشورے کے بغیر بنانا چاہتا تھا۔ دنیا میں صرف ایک خاتون ہے جو صرف مانگنے پر مشورہ دیتی ہے‘ وہ ہے لیڈی ڈاکٹر۔ مگر مس پریشانی نے کبھی مشورہ نہیں دیا‘ ہمیشہ فیصلہ دیا ہے۔ اس سے قبل مرد ہی عورتوں کو فیصلے دیتے آئے ہیں۔ محترمہ کے والد امیر عورت سے شادی کرنا چاہتے تھے‘ اس لیے ان کی پہلی بیوی امیر بیگم تھی۔ مس پریشانی نے بھی زردار چنے۔ مگر شادی کے بعد وہ مسز زرداری نہ بنیں۔ مس بے نظیر نے اپنے خاوند کو مسٹر بے نظیر بنا دیا۔ مسٹر بے نظیر خود بڑی خوبیوں والے ہیں۔ جیسے وہ سانس لیں تو صاف ہوا اندر جاتی ہے۔ ان کا دل ہر وقت دھڑکتا رہتا ہے۔ چلیں تو سایہ ساتھ ساتھ چلتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ شوہر کامدار ہیں جنہیں بیوی کی تقریر سننے کے لیے دیر سے گھر جانے کی بجائے جلدی اسمبلی جانا پڑتا ہے۔ مس پریشانی کا بحیثیت وزیراعظم بیس ماہی اقتدار دراصل ماہی کا اقتدار ہی تھا۔

کہتے ہیں عابدہ حسین بے نظیر سے بڑی سیاست دان ہیں۔ جنہوں نے عابدہ حسین کو دیکھا ہے‘ وہ مانتے بھی ہیں۔ عابدہ حسین تو اتنی بڑی ہیں کہ بندہ ان سے بات کر رہا ہو تو اسے لگتا ہے وہ اجتماع سے خطاب کر رہا ہے۔ جبکہ محترمہ کی صحت مندی کے بارے میں یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی صحت "مندی" ہی ہے۔ پارٹی کے لوگ ہر کام ان سے پوچھ کر کرتے ہیں۔ وہ تو یہ بھی پوچھتے ہیں کہ بی بی سوموار کو پارٹی لائن کے

مطابق کون سا دن ہو گا۔ اس بار دسمبر کے مہینے میں مارچ آئے گا؟ جن سیاست دانوں کے پیچھے لاکھوں ہوں' انہیں نظر نہیں آتا اور اگر ان کے پیچھے کوئی نہ ہو تو وہ کسی کو نظر نہیں آتے۔ مس پریشانی کو اس معاشرے میں لاکھوں لوگ چاہتے ہیں۔ جس معاشرے میں ایک بھی مرد چاہے تو یہ بھی چھوٹی بات نہیں سمجھی جاتی۔ محترمہ اپنی ذات سے نہیں' ذہانت سے متاثر کرتی ہیں۔ ویسے ذہانت عورت کی وہ خوبی ہے جس کا نہ ہونا بھی خوبی سے کم نہیں۔

پورے کام کو آدھا نہیں کرتیں' آدھے کام کو پورا کرتی ہیں۔ ان ملکوں میں رہیں جہاں عورتوں کا لباس دیر سے شروع ہوتا ہے اور جلد ختم ہوتا ہے' مگر وہ اب ایسا لباس پہنتی ہیں جو جلد شروع ہو جاتا ہے اور دیر سے ختم ہوتا ہے۔ وہ جمہوریت کی شہزادی ہیں۔ ان سے پوچھو۔ "جمہوری حکومت سے کیا مراد ہے؟" کہیں گی۔ "ہماری حکومت" سندھی کو مادری زبان کہتی ہیں۔ ان کی مادری زبان ان کی والدہ کو نہیں آتی۔ بچپن میں محترمہ نے دوسرے بچوں سے پہلے بولنا شروع کر دیا۔ اب بھی اپنی پسند کی آواز سننا چاہیں تو بولنے لگتی ہیں۔ سننا تو اب تک نہیں آتی۔ انہوں نے اردو کا ٹیوٹر رکھا تا کہ اردو کی غلطیاں نکال سکے۔ حالانکہ ان کی اردو پڑھ کر لگتا ہے کہ ٹیوٹر کو ان کی درستیاں نکالنا چاہئیں۔ اب بھی محترمہ کی اردو سمجھنے کے لیے اردو کی سمجھ ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا انگریزی کی۔ اردو کی املا تو اب بھی ایسی ہے کہ عامر کو آمر' ذیابیطس کو ضیا بیطس اور ضیاء الحق کو ضیاع الحق ہی لکھتی ہیں۔ البتہ آمر یوں کہتی ہیں جیسے کہہ رہی ہوں۔ "آ .... مر"

مقرر ایسی کہ کمیونزم پر کئی گھنٹے ایک فقرہ بھی اس کی حمایت اور مخالفت میں کہے بغیر تقریر کر سکتی ہیں۔ دوسرے لیڈروں سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ جیسی باتیں دوسرے سیاست دان سوچے سمجھے بغیر کہہ دیتے ہیں' وہی یہ سوچ کر کہتی ہیں۔ جتنا وہ کام کرتی ہیں اور نہیں تھکتیں' اتنا تو ہم آرام کریں تو تھک جائیں۔

مصروفیت کا یہ عالم کہ خاوند سے ملاقات ہونا تو دور کی بات' کئی کئی ماہ محترمہ کی خود سے ملاقات نہیں ہو پاتی۔ وہ خوفزدہ لڑکی ہیں اور خوفزدہ لڑکی سے نڈر کوئی نہیں ہو سکتا۔

سوانح عمریاں پڑھنے کا شوق ہے۔ جب پسند کی سوانح عمری کو دل چاہا تو اپنی سوانح عمری لکھ دی۔ بڑی بات پر خوش نہیں ہوتیں' البتہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر ناراض ہو جاتی ہیں۔ شروع میں پارٹی میٹنگز میں کوئی ان سے اختلاف کرتا تو روتی ہوئی اٹھ جاتیں۔

اب یہ کام اختلاف کرنے والے کو ہی کرنا پڑتا ہے۔ بقول کرسٹینا لیمب ------ وہ بحیثیت وزیراعظم سرکاری دعوتوں میں کھانوں اور برتنوں پر زیادہ توجہ دیتیں۔ اتنی توجہ اس مسئلے پر نہ دیتیں جس وجہ سے یہ دعوت دی ہوتی۔ ایسے دل کی ہیں کہ اگر ان کے ہاتھ کا پکا کھانا بلی کھا لے تو انہیں اتنا دکھ ہو گا کہ اس وقت تک اداس بیٹھی رہیں گی جب تک آپ یقین نہ دلا دیں کہ بلی بچ جائے گی۔ انہیں پاکستانی سفید بلیاں پسند ہیں جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ پاکستانی سفید بلیاں کالی نہیں ہوتیں۔

عمر کے معاملے میں عورتوں کا یہ رویہ رہا ہے کہ جب وہ چھوٹی ہوتی ہیں تو چاہتی ہیں انہیں بڑا سمجھا جائے اور جب بڑی عمر کی ہو جاتی ہیں تو چاہتی ہیں' انہیں چھوٹی سمجھا جائے مگر محترمہ ان خواتین میں سے ہیں جو کسی کو خود سے بڑا نہیں سمجھتیں۔ وہ تو چچوں کو یوں بلاتی ہیں جیسے بچوں کو بلا رہی ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت میں کم سے کم دوست اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دشمن بنانے کا گر جانتی ہیں۔ مولویوں کے بارے میں ان کی رائے وہی ہے جو مولویوں کی ان کے بارے میں ہے۔ نصرت بھٹو اور بے نظیر کے اسٹائل میں اتنا ہی فرق ہے' جتنا ان کے ہیئر سٹائل میں۔

کہتی ہیں میں سیاست دان نہ ہوتی تو اخبار کی ایڈیٹر ہوتی۔ ویسے ہر عورت میں ایڈیٹر بننے کی پیدائشی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ خاوند کی جیب ان سے اچھی کون ایڈٹ کر سکتا ہے۔

کہتی ہیں بلاول کو وکیل بناؤں گی یا فوجی جرنیل۔ فیصلہ صحیح ہے۔ اگر فوجی جرنیل بن گیا تو راج کرے گا اور اگر وہ نہ بن سکا تو پھر وکیل ہونا چاہیے تا کہ اپنے خلاف

ہونے والے مقدمے تو لڑ سکے۔ ارسطو کہتا ہے کہ کسی کی افتاد طبع کا سراغ اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے ملتا ہے' بڑے بڑے کاموں سے نہیں۔ بڑے کام تو بندہ سوچ سمجھ کر کرتا ہے اور بسا اوقات طبیعت کے خلاف کرتا ہے۔ مگر محترمہ نے ساری زندگی کبھی چھوٹا کام کیا ہی نہیں۔ وہ تو سر درد کی دوا بھی کھا رہی ہوں تو لگتا ہے' قوم کا درد سر کم کرنا چاہتی ہیں۔ خود پر اتنا اعتماد ہے کہ کسی پر اعتماد نہیں۔ والد کے نقش قدم اور نقش قدم پر چل رہی ہیں۔ مارشل لاء سے اتنا ڈرتی ہیں کہ اس کی موجودگی میں ان کے منہ سے کرسی نہیں' آیت الکرسی نکلتی ہے۔ ضیاء الحق کو قاتل کہتی ہیں حالانکہ وہ تو انتقال دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ جیتے جی ان سے اقتدار کا انتقال نہ دیکھا گیا کسی اور کا کیا دیکھا جاتا۔ ضیاء الحق ست آدمی تھے کہ انہوں نے نوے دن کا کام نو سال میں کیا' جبکہ محترمہ اتنی تیز نکلیں کہ پانچ سال کی حکومت ڈیڑھ سال میں پوری کر دی۔ وہ فتح حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں' یہاں تک کہ ہار بھی سکتی ہیں۔ ضیاء الحق مارشل لاء میں اکثر کارکنوں نے انہیں کمر دکھائی۔ کچھ نے اس لیے بھی دکھائی تا کہ اس پر پڑے کوڑے دکھا سکیں۔ میاں نواز شریف کے اس قدر خلاف ہیں کہ ایک وقت ایسا آیا کہ میاں کا نام لینا چھوڑ دیا۔ ان دنوں وہ اللہ میاں کو بھی اللہ صاحب کہنے لگیں۔ اقتدار میں آنے کے لیے مزاروں پر چادریں چڑھائیں' ایک چادر خود پر بھی چڑھا لی۔

مس پریشانی بے نظیر کم' بھٹو کی بیٹی' مرتضیٰ اور شاہنواز کی بہن' آصف کی بیوی اور بلاول کی ماں زیادہ ہوتی ہیں۔ ان میں عظیم سیاست دان بننے والی تمام خوبیاں موجود ہیں اور انہوں نے خود کو بڑی مشکل سے عظیم سیاست دان بننے سے روکا ہوا ہے اور اپنی مقبولیت کم کرنے کے لیے دن رات کام کر رہی ہیں۔ ان کا سیاسی سفر جو زیڈ اے (ذوالفقار علی بھٹو) سے شروع ہوا' اب اے زیڈ (آصف زرداری) تک آ گیا ہے۔

- ## سٹیل مین

وہ سیاست کے "میاں" ہیں اور اس کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں۔ اس سے انہوں نے اپنا "لوہا" منوایا ہے۔ وہ پاکستان کے واحد سیاست دان ہیں جن کا نام جو بھی لیتا ہے' انہیں شریف ضرور کہتا ہے۔ مہاتما گاندھی جب تک بولنے نہ لگتے' سیاست دان نہ لگتے۔ یہ بھی جب بولنے نہ لگیں "شریف" کے بیٹے لگتے ہیں' سیاست دان نہیں لگتے۔ چپ ہوں تو لوگوں کو شبہ ہوتا کہ انہیں سیاست کا کچھ پتہ نہیں۔ بولیں تو یہ شبہ دور ہو جاتا ہے۔ شکل و صورت ایسی کہ جب وہ کچھ بھی نہیں تھے' تب بھی کچھ تھے۔ کالج کے زمانے میں پروفیسر مشکور حسین یاد انہیں کلاس میں کھڑا کر کے کہتے۔ "مسٹر تم ہنس کیوں رہے ہو؟" تو یہ جواب دیتے۔ "سر' میں ہنس تو نہیں رہا۔ میری شکل ہی ایسی ہے۔" اپنے پہلے ہی الیکشن میں اخباروں اور اشتہاروں میں ایسی رنگین تصویریں چھپوائیں کہ انہیں حکومت نہ ملتی تو فلمیں ضرور مل جاتیں۔ اتنے اچھے ماحول میں پرورش پائی کہ ان کے بڑے ہو کر سیاست دان بننے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس گھرانے میں تو پارٹی سے مراد بھی کھانے کی پارٹی لیا جاتا۔ وہ صنعت سے سیاست میں آئے اور سیاست صنعت میں آ گئی۔ ایسی صنعت جس میں لاکھ لگاؤ اور ساکھ کماؤ' ساکھ لگاؤ اور لاکھ بناؤ۔ سیاست کے لیے دولت ماں کا دودھ ہے۔ سمرسٹ ماہم نے کہا۔ "دولت چھٹی حس ہے' لیکن اس کے بغیر آپ دوسری پانچ حسوں کو بھی استعمال نہیں کر سکتے۔" میاں صاحب بڑے سے بڑا کیس بھی "بریف کیس" بنا دیتے ہیں۔ بقول ایماڈنکن "نواز شریف تحریک استقلال میں بینک کی حیثیت رکھتے' ضیاء الحق نے اسے قومیا دیا۔" پہلے "فدا مسلم لیگ" پر فدا رہے' پھر مسلم لیگ ان پر فدا ہو گئی۔ بقول پیر پگاڑا "ضیاء الحق نے مارشل لاء دور میں جو وزیراعلیٰ تخلیق کئے' یہ ان میں سے ایک ہیں۔"

پنجاب میں کبھی ٹوانہ خاندان سیاست میں اہم تھا' پھر ایسے جاگیردار روپے میں "ٹو" آنہ

ہی رہ گئے۔ میاں صاحب صنعت کار ہیں۔ یوں صنعت اور کار پر روانی سے بولتے ہیں۔ بقول ٹائم "وہ خارجہ پالیسی کی بجائے مرسیڈیز کاروں پر زیادہ روانی سے گفتگو کرتے ہیں۔"

خدا نے انہیں بہت کچھ دیا' اور یہ بتانے کے لیے کہ خدا نے انہیں کیا کیا دیا ہے' خدا نے انہیں بہت کچھ دیا ہے' مشیر دیئے۔ یہ سب "اتفاق" کی برکت ہے۔ بھٹو مرحوم نے تو "اتفاق" کو ختم کرنا چاہا اور وہ ملک سے اتفاق ختم کرنے میں کامیاب بھی ہوئے مگر اتفاق سے ضیاء الحق آ گئے۔ تب سے ملک میں ہر طرف "اتفاق" ہی نظر آتا ہے۔ پنجاب کی دوستی' سندھ کی سادگی' سرحد کی دشمنی اور بلوچستان کی ویرانی مشہور ہے۔ لیکن اگر کوئی سیاست دان کی دوستی کی تعریف کر رہا ہو تو یقین کر لیں کہ وہ میاں صاحب کی تعریف کر رہا ہو گا۔ دوستوں کے ساتھ ملتے ہوئے دوست' تاجروں سے ملتے ہوئے تاجر' بچوں سے ملتے ہوئے بچہ اور حکمرانوں سے ملتے ہوئے حکمران ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہاں تو سکندر مرزا جیسے حکمران بھی گزرے ہیں جو بیوی سے ملتے ہوئے بیوی ہوتے۔

وہ بات کھلے دل' منہ اور جیب سے سنتے ہیں۔ پہلے تقریر یاد کر رہے ہوتے تو لگتا' ان کا امتحان ہے۔ مگر جب وہ تقریر کرتے تو لگتا' امتحان سننے والے کا ہے۔ لکھی تقریر یوں کرتے جیسے فی البدیہہ کر رہے ہیں' یعنی بے ربط۔ اب وہ تقریر یاد کر کے نہیں کرتے' تقریر وہ کرتے ہیں' یاد لوگ کرتے ہیں۔ ان کی انگریزی سمجھنے کے لیے بندے کے لیے اردو جاننا ضروری ہے۔ کہتے ہیں گورنر میاں اظہر صاحب بی اے ہیں' مگر لگتے نہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی میں بھی رہے۔ جی ہاں' چند گھنٹے وہاں رہے۔ وہ پاکستان کے سب سے مہنگے لیڈر ہیں۔ جلسوں میں اتنا خرچہ آتا ہے کہ ایک ایک لفظ کئی کئی لاکھ کا پڑتا ہے۔ ہمارے بوڑھے سیاست دان تو جوڑ توڑ اور جوڑ درد میں مبتلا رہے ہیں' لیکن میاں صاحب نوجوانی میں مبتلا ہیں۔ بندہ ان کے پاس جس مسئلے کے ساتھ جائے' جب واپس آتا ہے تو وہ مسئلہ نہیں ہوتا۔ اگر مسئلہ وہی ہو تو بندہ وہ نہیں ہوتا۔ وہ مخالفوں کی ہر بات کا جواب ترکی بہ ترکی ہی نہیں دیتے' ترقی بہ ترقی بھی دیتے ہیں۔

رنجیت سنگھ کے بعد پنجاب پر سب سے زیادہ حکومت کرنے والے حکمران ہیں۔ کہتے ہیں' سکھ خالصتان ابھی تک اس لیے نہیں بنا سکتے کہ ان کے لیڈر بڑے سکھ ہیں' لیکن میاں صاحب "ان سکھ" سیاست دان ہیں۔ رنجیت سنگھ تو ہر کسی کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتے' یہ تو ہر کسی کے لیے الگ آنکھ رکھتے ہیں۔ اپنی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے کام کرتے ہیں۔ وہ متاثر کرنے کی کوشش نہیں کرتے' شاید اسی لیے متاثر کرتے ہیں۔ اپنے دہن اور دھن کے پکے ہیں۔

وزیراعلیٰ پنجاب تھے تو لوگ انہیں لاٹ صاحب نہ کہتے' الاٹ صاحب کہتے۔ وزیراعلیٰ تھے تو پلاٹ یوں دیتے جیسے وزیراعظم بن کر پیلی ٹیکسیاں دیں۔ دوستوں کو دیکھ کر بے اختیار ان کی طرف نہیں لپکتے' بااختیار لپکتے ہیں۔

ہر وہ کام کرتے ہیں جس میں فائدہ ہو۔ وہ تو ہر کسی سے مسکرا کر بھی شاید اس لیے ملتے ہیں کہ انہیں پتہ ہو گا' مسکرانے پر پندرہ مسلز کو کام کرنا پڑتا ہے' جبکہ تیوریاں چڑھانے میں ۶۵ مسلز لگتے ہیں۔ والد صاحب انہیں سخت سزا دینے چاہتے تو کتاب دیتے۔ ان کی پسندیدہ بک چیک بک ہے۔ غلطی کرنا انسان کا کام ہے اور اسے دوسروں کے کھاتے میں ڈالنا سیاست دان کا۔ صفائی کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ جس کام کے پیچھے پڑتے' ہاتھ دھو کر پڑتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں' ان کے بارے میں بری رائے رکھیں تو انہیں کبھی نہ ملیں اور اگر آپ چاہتے ہیں' ہمارے بارے میں اچھی رائے رکھیں تو ہمیں کبھی نہ ملیں۔

کرکٹ پسند ہے۔ ہمیں یہ اس لیے پسند ہے کہ اس میں کئی "اوور" ہوتے ہیں۔ کرکٹ میں کوئی "نو بال" کہہ دے تو برا مان جاتے ہیں کہ کھیل میں ذاتیات پر نہیں اترنا چاہیے۔ بچپن میں کرکٹ کھیلتے' محلے کی ٹیمیں ٹاس کرتیں۔ جو جیت جاتی' یہ اس کی طرف سے کھیلتے۔ حالانکہ ہمارے بچپن میں دونوں ٹیمیں ٹاس کرتیں' جو ہار جاتی اسے ہمیں اپنی ٹیم میں شامل کرنا پڑتا۔ عوامی سوٹ انہیں سوٹ کرتا ہے۔ دن میں کئی بار

لباس بدلنے کی عادت ہے۔ یہ تب سے ہے جب ابھی وہ چند ماہ کے تھے۔
وہ پیاس سے مرے جا رہے ہوں' تب بھی ان کے ہونٹ سوکھے نظر نہیں آئیں گے۔

اور اگر ان کے ہونٹ خشک ہیں تو وہ پیاسے نہیں ہیں۔ خوبصورتی میں وہاں تک چلے جاتے ہیں' جہاں تک خوبصورتی جاتی ہے۔ برے کو ہی اس کے گھر تک چھوڑ کر نہیں آتے' اچھے کو بھی اس کے گھر تک چھوڑنے جاتے ہیں۔ سیاست میں صحت مندانہ رجحان لانے کے لیے صحت کو بہتر بنانے کا رجحان ہے۔ اگرچہ وہ تو اپنے سسرال میں قدم رکھیں تو دوسرا قدم اکھاڑے میں پڑتا ہے۔ ویسے کشتی اور سیاست میں یہی فرق ہے کہ کشتی لڑنے والا اپنے کپڑے خود اتارتا ہے۔ نوجوانی میں وہ دوستوں سے یوں گھل مل جاتے' لگتا مل نہیں رہے گھل رہے ہیں۔

اقتدار نے انہیں پروان چڑھایا۔ اب وہ اقتدار کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ ایسی شخصیت ہیں کہ جس کاندھے پر ہاتھ رکھ دیں' وہ ان کو کاندھا دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بڑے حتمی اور حاتمی فیصلے کرتے ہیں۔ ان کو ساتھ ملا کر حکومت کی' جو مل کر گھوڑا بناتے' تو جو بنتا وہ اونٹ ہوتا۔ انہیں گالی دی جائے تو وہ لوٹاتے نہیں۔ جس کی وجہ پیپلز پارٹی یہ بتاتی ہے کہ بزنس مین ہیں' جو ملے گا واپس نہیں کریں گے۔ مصطفیٰ کھر کے بارے میں پوچھا جائے کہ وہ آج کل پی پی پی میں ہیں یا این پی پی میں؟ تو اکثر جواب ملتا ہے' آج کل بیڈ روم میں ہیں۔ جبکہ میاں صاحب بیڈ روم میں بھی ہوں تو جواب ملتا ہے مسلم لیگ میں ہیں۔

انہوں نے کئی بندوں کو سیاست دان بنایا اور کئی سیاست دانوں کو بندہ بنایا۔ ویسے بھی اقتدار کی کرسی پر چڑھنے کے لیے اپنے سے اوپر والے کے پاؤں کو سر سے اور نیچے والے کے سر کو پاؤں سے ٹھوکر مارنا پڑتی ہے۔ بہرحال میاں صاحب وہ خاص آدمی ہیں' جو کبھی کبھی عام آدمی بن کر وہی محسوس کرتے ہیں جو عام آدمی کبھی کبھی خاص بن کر محسوس کرتا ہے۔

• مسز مسلم لیگ

ہم نے ایک دوست سے پوچھا۔ "جس شخص سے کہا جائے کہ آپ فوراً کچھ کر لیں' آپ کا تختہ الٹا جا رہا ہے اور وہ آگے سے کہے' اچھا سائیں! دیکھا جائے گا۔ آپ ایسے شخص کو کیا کہیں گے؟" تو دوست بولا۔ "میں اسے محمد خان جونیجو کہوں گا۔"

جونیجو صاحب ہمارے ملک کے دوسرے بڑے سیاستدان تھے۔ آپ پوچھیں گے۔ پہلے بڑے سیاست دان کون تھے؟ تو اس کا جواب ہے۔ "باقی سب" جونیجو صاحب کو پہچاننا بڑا آسان ہوتا' اگر دو سیاست دان گفتگو کر رہے ہوتے اور ان میں سے ایک بور ہو رہا ہوتا' تو دوسرا محمد خان جونیجو ہوتا۔ وضع قطع ایسی جو اتنی وضع نہ ہوتی جتنی قطع ہوتی۔ دیکھنے میں سیاست سے زیادہ ان کا تعلق محکمہ زکوٰۃ سے لگتا۔ انہوں نے سیاست سے پاک سیاست کی۔ سیاسی قد ایسا کہ انہیں دیکھنے والی کی پگڑی گر پڑتی' مگر یہ پگڑی اکثر آگے کو ہی گرتی۔ وہ سیاست میں شرافت کا نمونہ تھے۔ سیاست میں ایسے نمونے کہاں ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا' آپ کمزور سیاست دان ہیں تو انہوں نے کمزوری دور کرنے کے لیے دودھ گھی شروع کر دیا۔ بچپن ہی سے صحت ایسی تھی کہ پہلی بار جب ڈاکٹر دیکھا تو بمشکل دیکھا کیونکہ زیادہ عمر ہونے کی وجہ سے نظر کمزور ہو چکی تھی۔

وہ بچپن میں اتنے تیز تھے کہ سکول سے ایک بجے چھٹی ہوتی تو پونے ایک گھر پہنچ جاتے مگر بڑے ہو کر بڑے سست ہو گئے۔ اتنا لیٹ آنے لگے کہ انہیں ریلوے کا وزیر بنا دیا گیا۔ پیر پگاڑا تو انہیں ریلوے بابو کہتے۔ ضیاء الحق نے انہیں وزیراعظم کی نوکری دی تو وہاں بھی ان کی پوزیشن ہمیشہ انجن کی بجائے ڈبے کی ہی رہی اور آپ جانتے ہیں' جب ڈبے کو انجن کے آگے لگایا جائے تو پھر انجن اسے دھکیلتا ہے' کھینچتا نہیں۔

وہ وزیراعظم تھے تو نئے آنے والے سے ان کا یہ کہہ کر تعارف کرایا جاتا کہ یہ

وزیراعظم صاحب ہیں۔ ان کے وزیراعظم بننے پر پاکستان کا ہر فرد خوش ہوا کہ اگر یہ بن سکتے ہیں تو میں بھی بن سکتا ہوں۔ ہمارے ایک محلے دار نے تو اس ڈر سے سیاست چھوڑ دی کہ اس حساب سے اگلی باری میری ہے۔ اور اگر میں وزیراعظم بن گیا تو اتنا مشہور ہو جاؤں گا کہ صبح دہی لینے نکلوں گا تو شام کو کہیں گھر واپس آ سکوں گا' کیونکہ راستے میں ہر کوئی اپنا مسئلہ لیے بیٹھا ہو گا۔

ہمارے بیشتر سیاست دانوں نے وزیراعظم بننے کی کوشش کی اور ناکام رہے۔ انہوں نے وزیراعظم ہوتے ہوئے وزیراعظم بننے کی کوشش کی اور ناکامیاب رہے۔ ضیاء الحق نے جب انہیں وزیراعظم بنایا تو یہ یوں خوش تھے جیسے سیور ریفل ٹکٹ پر ان کا وزیراعظم کا انعام نکلا ہو۔ پیر پگاڑا صاحب کہتے ہیں۔ "ہم (سندھ) نے پاکستان کو دو وزیراعظم دیئے' ان کی لاشیں ملیں' ہم نے ایک لاش دی تو اسے وزیراعظم بنا دیا۔"

سندھڑی آم کی طرح میٹھی شخصیت محمد خان جونیجو نے ۱۹۳۲ء میں پہلی بار "سندھڑی" میں آنکھ کھولی۔ دوسری بار کب کھولی' پکا پتہ نہیں۔ لندن سے سینئر کیمبرج اور زراعت میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ لندن انہیں پسند تھا کیونکہ وہاں انگریز اپنا منہ صرف ماؤتھ ٹو ماؤتھ سانس دلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی زبان بھی ناک میں ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تو ناک میں دم ہوتا ہے۔ جونیجو صاحب کا بھی منہ کھلا ہوتا تو لوگ سمجھتے' سانس لینے کے لیے کھولا ہو گا یا دوسرے کی بات سننے کے لیے۔ منہ سے الفاظ یوں نکالتے جیسے ریزگاری نکال رہے ہوں' یعنی گن گن کر۔ چلاتے تک سرگوشی میں۔ جس کام کے لیے دوسرے زبان ہلاتے' یہ خود کو ہلاتے۔ جب تک بلند آواز میں نہ بولتے' خود اپنی بات نہ سن سکتے۔ بیک وقت ہاں اور ناں یوں کہتے کہ دونوں کا مطلب ایک ہی ہوتا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو پسینہ سکھانے کے لیے دھوپ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کوئی زیادتی کرتا' اسے اتنی جلدی معاف کر دیتے کہ لگتا انہیں پہلے ہی پتہ تھا کہ یہ زیادتی کرے گا۔

وہ پیر پگاڑہ صاحب کی دریافت ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں' وہ ان کی ایجاد ہیں۔ وزیراعظم تھے تو ماتحتوں کے ٹیلیفون بل تک چیک کرتے' ان کے دور میں تو چائے منگوانے کے لیے فائل موو کرانا پڑتی۔ سابق وزیر جسونده سنگھ کی طرح وہ بہت بچت کرتے۔ جسونده سنگھ تو پٹرول یوں بچاتے کہ جس گاڑی میں دفتر آتے' اسے ڈرائیور کو دے کر واپس گھر بھجوا دیتے اور دفتر کے بعد خود پیدل گھر جاتے تا کہ پٹرول کی بچت ہو۔ پہلے جونیجو صاحب کے فیصلے بڑے دانشمندانہ ہوتے' مگر بعد میں انہوں نے خود فیصلے کرنا شروع کر دیئے۔ یہ غلط ہے کہ وہ آج کا کام کل کرتے' وہ تو کل کا کام بھی آج کرتے۔ کبھی دوسروں کی غلطیوں سے فائدہ نہ اٹھایا۔ انہوں نے تو کبھی اپنی غلطیوں سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اگر کسی کام میں جلدی کی تو وہ دیر کرنے میں۔ وہ تو جتنی دیر میں شیو کرتے' اتنی دیر میں شیو پھر اتنی ہی ہو چکی ہوتی۔ وہ بارات میں شامل ہونے کے لیے گھر سے نکلتے تو ولیمے پر پہنچتے۔ ایک بار انہیں صبح کی ایک تقریب میں پابندی وقت پر تقریر کرنا تھی' آپ تقریب میں پہنچے اور کہا۔ "گڈ آفٹر نون"

اوجڑی کیمپ جب اجڑی کیمپ بنا تو انہوں نے کہا' اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ واقعی جب یہ واقعہ ہوا' ان کے دونوں ہاتھ ان کی جیب میں تھے۔ ان دنوں انہیں بہت کم نیند آتی' ہر چند روز کے بعد اٹھ پڑتے۔ ضیاء الحق نے جب اسمبلی توڑی تو کسی نے ان سے پوچھا۔ "ایسا آپ کے ذہن میں تھا؟" کہا۔ "میرے ذہن میں تو کچھ نہیں تھا۔" تو سننے والے نے کہا۔ "واقعی ذہن میں کچھ ہوتا تو ایسا کیوں ہوتا۔"

وہ کاہل سہی مگر ان کا ذکر ممتاز کاہلوں میں نہیں ہو سکتا۔ ذوالفقار علی بھٹو وزیراعظم بننا چاہتے تھے۔ یہ جب وزیراعظم تھے' ذوالفقار علی بھٹو بننا چاہتے تھے۔ بولتے یوں جیسے بھٹو صاحب چپ ہوتے' یعنی دوسروں کو کچھ پتہ نہ ہوتا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ بھٹو صاحب جیسی گاڑی اور وہی ڈرائیور ہی نہ رکھا' بلکہ گاڑی کی رفتار بھی وہی رکھی۔ مزاج ایسا تھا کہ جو دروازہ بٹن دبانے سے کھلتا' اس کے کھلنے پر بھی "شکریہ" کہتے۔

صبح چھڑی لے کر یوں واک کرنے نکلتے کہ لگتا چھڑی کو واک کرانے نکلے ہیں۔ پیر پگاڑہ صاحب کو ملنے جاتے تو جوتا پہلے اتار لیتے۔ انہیں اس بات پر بھی غصہ آتا' جس پر جو غصہ نہ کرے اس پر غصہ کرنا چاہیے۔ پرائم منسٹر تھے تو ان کے ساتھ P.M. بھی لکھا ہوتا۔ تو لوگ اس سے مراد وقت ہی لیتے۔ ان کا پانچ نکاتی پروگرام نقاہتی پروگرام ثابت ہوا۔ اس قدر محتاط ہوتے کہ احتیاط کرنے میں بھی احتیاط کرتے۔ وہ سیاست میں یکدم پیچھے سے آگے آئے اور اتنا آگے نکل گئے کہ ان کے پیچھے دور دور تک کوئی نہ تھا۔ مسلم لیگ ان کی وہ کمزوری رہی جس میں ان کی طاقت تھی' لیکن جب مسلم لیگ پوری ہوتی' وہ اس کے پورے صدر نہ ہوتے۔ جب وہ اس کے پورے صدر ہوتے تو مسلم لیگ پوری نہ ہوتی۔ لوگ انہیں مسلم لیگ کی بیوہ کہتے' مگر جب وہ نہ رہے تو مسلم لیگ بیوہ ہو گئی۔ ہر جگہ دیر سے پہنچنے والے محمد خان جونیجو نے صرف اللہ کے پاس پہنچنے میں جلدی کی۔

○○○

• سندھی گاندھی

ہم سمجھتے ہیں' بھارت والے مہاتما گاندھی کی اس لیے پوجا کرتے ہیں کہ ان کے نام "گاندھی" میں ہندوؤں کی سب سے مقدس ہستی آتی ہے۔ وہ ہے "گاں" یعنی گائے اور ساتھ "دھی" بھی ہے۔ گائے دودھ کی فیکٹری ہے جس کی چار ٹانگیں اور ایک دم ہوتی ہے' جو دم نہیں لینے دیتی۔ بچپن میں ماسٹر جی ہم سے پوچھتے۔ "کن کن چیزوں میں دودھ ہوتا ہے؟" تو ہم کہتے۔ "چائے اور گائے" سو گاں دھی ہمارے لیے کھانے کی چیزیں ہیں۔ پھر پتہ نہیں جی ایم سید کو سندھی گاندھی کیوں کہا جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی کی طرح ان کا لباس بھی ایسا نہیں ہوتا' جیسے ہو تو لوگ یہ نہ کہیں کہ اس نے جسم چھپا رکھا ہے۔ یہی کہیں کہ جسم نے لباس چھپا رکھا ہے۔ پھر بھی گاندھی جی کی لنگوٹی اتنے کام کی تھی کہ اب تک ان کے محاوروں اور ہمارے محاروں میں استعمال ہوتی ہے۔ ان سے قبل ہمارے پاس سرحدی گاندھی تھے۔ ان تینوں گاندھیوں میں ہمیں تو خرابی صحت کے علاوہ اور کچھ مشترک نظر نہیں آیا۔ مہاتما گاندھی اتنے سوم تھے کہ آپ انہیں مہاتما سوموار کہہ سکتے ہیں۔ مہاتما بدھ کو آپ پہلے ہی جانتے ہیں۔ سندھی گاندھی سید ہیں۔ یوں آپ انہیں مہاتما جمعرات کہہ سکتے ہیں۔

پہلی بار ایسے سید گھرانے میں آنکھ کھولی' جہاں بچے کو پیٹنے سے پہلے بھی بسم اللہ شریف پڑھی جاتی ہے۔ البتہ دوسری بار کراچی کے آنکھوں کے ہسپتال میں آنکھ کھولی۔ بچپن میں غلام مرتضیٰ تھے' پھر جی ایم ہو گئے۔ نام کے ساتھ بعد میں سید یوں لکھتے جس طرح ہم جیسے ایم بی بی ایس لکھتے ہیں۔ گزشتہ تیس چالیس سالوں سے جو اہم کام کر رہے ہیں' وہ بوڑھا ہونا ہے۔ بہرحال اب وہ واحد سیاست دان ہیں جن کو بندہ کہہ سکتا ہے کہ اب آپ بوڑھے نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ ان کی مزید پندرہ بیس سال ہونے کی خواہش ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بوڑھے بھی انہیں بزرگ سمجھتے ہیں۔ بڑھاپے میں

آدمی دوسری بار بچپن گزار رہا ہوتا ہے' مگر اسے سمجھانے کے لیے گھر میں کوئی بڑا نہیں ہوتا۔ سندھی گاندھی بھی اپنا دوسرا بچپن گزار رہے ہیں' یقین نہ آئے تو ان کی باتیں سن لیں۔ ان کی سالگرہ پر ایک نوجوان سیاست دان نے کہا۔ "میری خواہش ہے کہ میں آپ کی سوویں سالگرہ میں بھی شرکت کروں تو انہوں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا' بظاہر تو تمہیں دیکھ کر مجھے یہی امید ہے کہ تم میری سوویں سالگرہ میں شرکت کے لیے موجود ہو گے۔"

اپنا شجرہ نسب وہاں تک لے جاتے ہیں جہاں نسب ابھی شجر پر ہی ہوتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو خود کو ۴۵ سال سے پاکستانی' چودہ سو سال سے مسلمان اور پانچ ہزار سال سے سندھی کہتے ہیں۔ اپنے سندھ میں پیدا ہونے پر اس قدر فخر کرتے ہیں جیسے یہ سب ان کی ذاتی کوششوں سے ہوا ہو۔ سندھ میں جی ایم سید کا بڑا احترام ہے۔ سندھی تو جس کا احترام کرنا چاہیں' اسے شاہ کہنے لگتے ہیں۔ جیسے دریائے سندھ کو بھی وہ دریائے شاہ کہتے ہیں۔

تحریک خلافت سے سیاست کا آغاز کیا۔ تحریک ختم ہو گئی' مگر وہ خلیفہ ہو گئے۔ مسجد منزل گاہ تحریک کے قائد کے طور پر مسجد کو منزل گاہ بنایا۔ ۱۹۴۳ء میں علیحدہ مسلم ملک کے لیے قرار داد پیش کی۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی قائداعظم کی رفاقت سے ہاتھ دھو لیے' اسی دن سے ہاتھ دھوئے ہوئے ہیں۔ بڑے ڈرانے والے بیان دیتے ہیں' مگر ان کے بیان سن کر رنگ پیلا نہیں پڑتا ہے کہ ان کا بڑا قابل بیان بھی ناقابل بیان ہوتا ہے۔

کہتے ہیں' میں کئی سال آگے دیکھتا ہوں' حالانکہ ان کی نظر ایسی ہے کہ کئی قدم آگے نہیں دیکھ سکتے۔ نظر کی عینک آنکھ سے لگائے رکھتے ہیں' جس کا یہ فائدہ ہے کہ انہیں عینک نظر آتی رہتی ہے۔ جو بات کرنا ہو' لکھ کر کرتے ہیں۔ اب تو یہ حالت ہے کہ جو بات سننا ہو' وہ بھی لکھ کر سنتے ہیں۔ ان کی اتنی کتابیں ہیں کہ اگر ہم ہر سال ایک کتاب لکھیں تو پھر بھی ان جتنی کتابیں لکھنے کے لیے ہمیں دو تین کتابیں

پیدا ہونے سے پہلے لکھنا پڑیں گی۔ ان کی ہر کتاب میں ایک ہی بات ہوتی ہے۔ ایک بار وہ پبلشر کے پاس اپنی نئی کتاب کا مسودہ لے کر گئے۔ پبلشر نے مسودہ ایک نظر دیکھ کر اس میں لگی پن نکال کر رکھ لی اور مسودہ سندھی گاندھی کو واپس دیتے ہوئے کہا۔ "سید سائیں یہ رکھ لیں' اس میں جو نئی چیز تھی وہ میں نے نکال لی ہے۔" لگتا ہے انہوں نے آخری کتاب پہلے لکھ لی' پہلی کتاب آخر میں لکھ رہے ہیں۔ لوگ ان کی کتاب پڑھ کر یہی کہتے ہیں۔ "ہم نے آپ کی کتاب پڑھ لی ہے' اب آپ یہ بتائیں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

سندھی گاندھی اتنے گھر میں نہیں رہتے' جتنے خبروں میں رہتے ہیں۔ ان کی پگڑ اور پگ تلے تاریخ کے قدیم خطے ہیں۔ ان کی ذات ایک خزانہ ہے۔ ویسے سندھ کے جو حالات ہیں' اس میں تو خزانہ بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے زمین میں دبا دیا جائے۔ چہرے پر ایک معصومیت اور مصروفیت۔ ان کے چہرے پر جو چیز سب سے واضح ہے' وہ ان کی عینک ہے جس کے بغیر ان کے لیے کچھ واضح نہیں ہے۔ انہیں تو عینک کے بغیر خواب تک صاف دکھائی نہیں دیتے۔

کتاب چھپوانے سے پہلے ہی اس پر پابندی لگوانے کا انتظام کر لیں گے۔ اگر پابندی نہ لگنے کا پچاس فیصد بھی شک ہو تو نہیں چھپوائیں گے۔ ویسے بھی ہمارے ہاں پابندی سے وہی کتاب پڑھی جاتی ہے جس پر پابندی لگی ہو۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اس قدر مستقل مزاج ہوتے ہیں کہ چاہیں تو اسپرین کو سر درد لگا دیں۔ وہ ان سیاست دانوں میں سے ہیں جن کا اگر کوئی ذہن تبدیلی کر سکتا ہے تو وہ نیورو سرجن ہی ہو سکتا ہے۔ تلفظ ایسا کہ بھاری کو بھاری کہتے ہیں۔ ان کے پاس سندھ کے ہر مرض کا علاج ہی نہیں' ہر علاج کے لیے ایک مرض بھی موجود ہے۔ تاریخ سے اس قدر لگاؤ ہے کہ جو بھی ملے' اس سے پوچھتے ہیں۔ "آج کیا تاریخ ہے؟" اتنی دیر گھر میں نہیں رہے' جتنی دیر جیل میں رہے۔ سو ان کے لواحقین جیل کو بھی اپنی منقولہ جائیداد سمجھتے ہیں۔

یادداشت ایسی کہ ان کے سامنے ایک بات کئی بار کی جائے تو انہیں یاد ہو گا کہ یہ کتنی بار کی گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ پتہ نہ ہو گا کہ کیا بات کی گئی۔ قائل کرنے کی ان میں بڑی صلاحیت ہے۔ وہ آپ کو وقت ضائع ہونے پر لیکچر دے رہے ہوں تو آپ فورا" قائل ہو جائیں گے کہ آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ جئے سندھ والے ان کی بات اس قدر مانتے ہیں کہ سندھی گاندھی چپ بھی ہوں تو وہ ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہوتے ہیں۔ ساری زندگی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ انہوں نے تو کبھی شرابی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد الیکشن میں کھڑے نہیں ہوئے۔ کہتے ہیں' میں اتنا بیمار ہوں کہ دو منٹ سے زیادہ کھڑا نہیں ہو سکتا۔ کہو جئے سندھ' سندھ میں ہاری ہے تو کہیں گے' جئے سندھ میں سندھی ہاری ہے۔ وہ پہلے پاکستان کے علمبردار تھے' اب الم بردار ہیں۔ اپنی "فطرت" کے باعث اب سندھ اور چھڑی کے سہارے کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتے۔

پاکستان کو اپنا "ٹوٹ انگ" کہتے ہیں۔ ان کے ماننے والے بڑے دنوں سے دن رات ایک کر رہے ہیں۔ اب تو وہاں دن رات ایک ہو بھی گئے ہیں کہ وہاں تو نوکری کے لیے ڈاکومنٹ سے مراد ڈاکو کا منٹ ہوتا ہے۔ شروع سے علیحدگی پسند تھے' جس کا مطلب یہ نہیں کہ جسے پسند کرنا ہوتا' اسے علیحدگی میں کرتے۔ وہ سیاست دان ہیں اور ہمارے ہاں سیاست دان ہوتے ہیں' سائنس دان نہیں ہوتے کہ سائنس دان پہلے اپنے سارے تجربے چوہوں اور خرگوشوں پر کرتا ہے اور سیاست دان براہ راست انسانوں پر۔ پھر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بنگلہ دیش بنانے والوں کو بنگلہ ملتا ہے نہ دیش۔

○○○

- ## ملا نصر الدین

ساری دنیا انہیں پیر سمجھتی ہے مگر وہ خود کو پیر نہیں، جوان سمجھتے ہیں۔ دیکھنے میں سیاست دان نہیں لگتے اور بولنے میں پیر نہیں لگتے۔ قد اتنا ہی بڑا، جتنے لمبے ہاتھ رکھتے ہیں۔ چلتے ہوئے پاؤں یوں احتیاط سے زمین پر رکھتے ہیں کہ کہیں بے احتیاطی سے مریدوں کی آنکھیں نیچے نہ آ جائیں۔ اتنا خود نہیں چلتے، جتنا دماغ چلتا ہے۔ دور سے یہی پتہ چلتا ہے کہ چل رہے ہیں۔ یہ کسی کو پتہ نہیں ہوتا، آ رہے ہیں یا جا رہے ہیں۔ سیاست میں ان کا وہی مقام ہے جو اردو میں علامتی افسانے کا۔ خاندان کے پہلے صبغتہ اللہ اول کے سر پر پگ باندھی گئی اور وہ پہلے پاگارہ پیر کہلائے۔ یہ بھی اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں جس کی چشم بھی چراغ ہے۔ بچپن ہی سے پردے کے اس قدر حق میں تھے کہ ۱۹۴۴ء میں جب کراچی ریلوے اسٹیشن سے انگلینڈ روانہ ہوئے تو پردے کی وجہ سے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ جا رہے ہیں یا جا رہی ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں یوں پاکستان کو واپس آئے جیسے پاکستان کو واپس لائے ہوں۔ کسی نے کہا۔ "انگلینڈ وہ جگہ ہے جہاں سب سے زیادہ دھند ہوتی ہے۔" کہا۔ "اتنی دھند تھی کہ جگہ نظر ہی نہ آئی۔"

پہلے کالعدم مسلم لیگ کے صدر بنے، پھر مسلم لیگ کے کالعدم صدر بنے، پھر مسلم لیگ بن گئے۔ اس لیے اب دوڑ وہ رہے ہوتے ہیں اور سانس مسلم لیگ کی پھولنے لگتی ہے۔

وہ بڑے پائے کے سیاستدان ہیں، جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں "چھوٹے پائے" کے سیاست دان ہوتے ہی نہیں، حالانکہ چھوٹے پائے مہنگے ہوتے ہیں۔ وہ پاکستانی سیاست کی اقوام متحدہ ہیں اور اقوام متحدہ وہ جگہ ہے جہاں دو چھوٹے ملکوں کا مسئلہ ہو تو مسئلہ غائب ہو جاتا ہے۔ چھوٹی اور بڑی قوم کا مسئلہ ہو تو چھوٹی قوم غائب ہو جاتی ہے اور اگر دو بڑی قوموں کا مسئلہ ہو تو اقوام متحدہ غائب۔

خود کو جی ایچ کیو میں کھڑا کرتے ہیں۔ جی ایچ کیو انہیں اتنا پسند ہے کہ ہمیں تو "جی ایچ کیو" سے مراد "جی حضوری کرنا" لگتا ہے۔ وہ مسلم لیگ کے خادم نہیں' خاوند ہیں اور مسلم لیگ ان کی بیوہ ہے۔ ان کے بیان پڑھ کر لگتا ہے جیسے ان کا تعلق محکمہ بندی سے ہے۔ شاید وہ اس لیے بار بار منصوبہ بندی پر زور دیتے ہیں کہ ابھی سات ماہ بھی نہیں ہوتے اور نئی مسلم لیگ کی ولادت ہو جاتی ہے۔

دوران گفتگو جہاں پتہ چلے کہ دوسرا ان کی بات سمجھ رہا ہے' فورا" بات بدل دیتے ہیں۔ آدھا دن وہ کہتے ہیں جو سننا چاہتے ہیں اور باقی آدھا دن وہ سنتے ہیں جو کہنا چاہتے ہیں۔ فقرہ یوں ادا کرتے ہیں جیسے بل ادا کر رہے ہوں۔ جس موضوع پر دوسرے ہائے ہائے کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ "ہائے" کہہ کر گزر جاتے ہیں۔ کسی کی بات کی پروا نہیں کرتے' مگر چاہتے ہیں ان کی بات پر واہ کی جائے۔ لوگ ان کو ملنے سے پہلے وضو کرتے ہیں۔ وضو تو دوسرے سیاست دانوں سے ملنے والوں کو بھی کرنا پڑتا ہے مگر ملنے کے بعد۔ جانوروں کی حرکتوں سے بہت محظوظ ہوتے ہیں' اس لیے کسی کی حرکت سے محظوظ ہوں تو بندہ پریشان ہو جاتا ہے کہ پتہ نہیں مجھے کیا سمجھ رہے ہیں۔ ان کے پاس کئی گھوڑے ہیں جو اکثر ریس اور الیکشن جیتتے رہتے ہیں۔ اپنی تعریف سن کر خوش نہیں ہوتے' آخر بندہ چوبیس گھنٹے ایک ہی بات سن کر خوش تو نہیں ہو سکتا۔

مرید اپنی نگاہیں ان کے پاؤں سے اوپر نہیں لے جاتے' اس لیے اگر کوئی مرید کہے کہ میں نے پیر سائیں کو ننگے دیکھا تو مطلب ہو گا' ننگے پاؤں دیکھا۔ پیر صاحب منفرد بات کرتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ پیر صاحب آپ نے ایک جوتا اتارا ہوا ہے تو کہیں گے۔ "نہیں' ہم نے ایک جوتا پہنا ہوا ہے۔" ان کی چائے میں چینی کم ہو تو کہیں گے۔ "اس چینی میں چائے زیادہ ہے۔" وہ جس کے سر پر ہاتھ رکھ دیں' وہ سر ہاتھ پر رکھ لیتا ہے۔ جب وہ پیر جو گوٹھ سے لاہور آتے ہیں تو پیر جو گوٹھ بھی لاہور آ جاتا ہے۔ ان دنوں لاہور کہاں جاتا ہے؟ اس کا پکا پتہ نہیں۔ مرید انہیں اپنے ہاتھ سے کام نہیں کرنے دیتے اس لیے پیر صاحب کے ہر کام میں کسی اور کا ہاتھ ہوتا ہے۔

ان سے حور کا ذکر پوچھو تو شاید حر کہیں۔ جی ایم سید کے بقول پیر صاحب جھوٹ نہیں بولتے۔ گویا وہ پیر صاحب کو سیاست دان نہیں مانتے۔ ویسے پیر صاحب کے الیکشن کے نتائج سے تو ہمیشہ یہ لگتا ہے کہ ووٹر ان کا انتخاب نہیں کرتے' یہ ووٹروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ وہ پیر ہیں جو دن میں اتنی بار ماشاء اللہ نہیں کہتے' جتنی بار مارشل لاء کہتے ہیں۔ برتھ ڈے ضرور مناتے ہیں۔ دوسرے سیاست دان شاید اس لیے نہیں مناتے کہ برتھ ڈے تو ڈے کو پیدا ہونے والے ہی منا سکتے ہیں۔
ان کی باتوں میں اتنا وزن ہوتا ہے کہ سننے والا اپنا سر بھاری محسوس کرنے لگتا ہے۔ ان کا ہر فقرہ کئی کئی کلو کا ہوتا ہے۔ فقرے تو دوسرے سیاست دانوں کے بھی کئی کئی کلو کے ہوتے ہیں' جی ہاں کئی کئی کلومیٹر کے۔ دوسرے کے تو بیانوں کی بھی اتنے کالی سرخی نہیں لگتی جتنے کالی سرخی ان کی خاموشی کی ہوتی ہے۔ ستاروں کے علم پر ایسا عبور ہے کہ فلمی ستاروں کی گردش تک کی پس و پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں۔

بہت اچھے کرکٹر ہیں۔ بحیثیت امپائر کئی بار سینچریاں بنائیں۔ فوٹو گرافی کا شوق ہے۔ کہتے ہیں۔ "میں ہمیشہ خوبصورت تصویریں بناتا ہوں۔" حالانکہ وہ خوبصورت کی تصویریں بناتے ہیں۔ مخالفین تک پیر صاحب کا اس قدر احترام کرتے ہیں کہ ان کے سیاسی حریف پرویز علی شاہ یہ نہیں کہتے کہ میں نے متعدد بار پیر صاحب کو ہرایا۔ یہی کہتے ہیں' پیر صاحب نے مجھے ہر بار جتوایا۔ صحافی بھی ان سے سوال کر رہے ہوں تو یہ انہیں یوں دیکھتے ہیں جیسے پیر سوالی کو۔
پیر صاحب کو فرشتے بہت پسند ہیں۔ فرشتوں میں یہی خوبی ہے کہ وہ سوچتے سمجھتے نہیں' بس جو کہا جائے کرتے ہیں۔ پیر صاحب کو زمینی فرشتے الیکشن ہرواتے ہیں' زمینی اور آسمانی فرشتوں میں وہی فرق ہے جو زمینی اور آسمانی بجلی میں ہے۔ آسمانی بجلی وہ ہوتی ہے جس کا بل نہیں آتا۔ پیر صاب اس وقت کے تعلیم یافتہ ہیں جب ایک میٹرک پڑھا لکھا آج کے دس میٹرکوں کے برابر ہوتا ہے۔ یہی نہیں' اس زمانے کا تو ایک ان پڑھ

آج کے دس ان پڑھوں سے زیادہ ان پڑھ ہوتا تھا۔

پیر صاحب کسی سیاست دان کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ جس کو سنجیدگی سے لیں، وہ مذاق بن جاتا ہے۔ وہ اتنے شگفتہ مزاج ہیں کہ ان کے کمرے کے گلدان میں پلاسٹک کے پودوں پر بھی پھول کھلنے لگتے ہیں جبکہ ان کے مرید اور کالعدم وزیراعظم محمد خان جونیجو ایسے تھے کہ ان کے کمرے میں تو پلاسٹک کے پھول بھی مرجھا جاتے۔ پیر صاحب کی چھٹی حس جانے والے حکمرانوں کا بتاتی ہے جبکہ باقی پانچ حسیں آنے والے کا۔ وہ کہتے ہیں۔ "حکمرانوں کو آئین کی نہیں، آئینے کی ضرورت ہے۔" ٹھیک کہتے ہیں۔ خضاب اور زیڈال بندہ آئین کی مدد سے تو نہیں لگا سکتا۔ ان کی طبیعت میں اتنی مستقل مزاجی نہیں، جتنی مستقل مزاجی ہے۔ سنجیدہ بات کو غیر سنجیدہ طریقے سے کہنا مزاح نہیں بلکہ غیر سنجیدہ بات کو سنجیدہ طریقے سے کہنا مزاح ہے۔ سوچتا ہوں اگر سیاست میں سنجیدگی آ گئی تو پیر صاحب کیا کریں گے؟

ooo

• شوہر اعظم

وہ مرزا جٹ کی نسل سے ہیں۔ اس لیے جس خاتون کو بھی دیکھا اسے صاحبہ نہیں صاحباں ہی سمجھا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ جب چند گھنٹوں کے لیے فارغ ہوں اور کوئی کام نہ ہو تو شادی کر لیتے ہیں۔ تعلیم تو ان کی اتنی ہی ہے جتنی غلام حیدر وائیں صاحب کی ہے۔ اور وائیں صاحب اتنی دیر زیر تعلیم نہیں رہے، جتنی دیر وزیر تعلیم رہے ہیں۔ بہرحال شوہر اعظم ملک جی ایم غیر سید نے شادیوں پر پی ایچ ڈی کی ہے۔ ان کی شادی پر تو فوٹو گرافر پولورائیڈ کیمرے استعمال کرتے ہیں۔ کہیں یہ نہ ہو کہ جب تک تصویریں دھل کر آئیں، یہ نئی شادی کر چکے ہوں۔ وہ اگر کہیں کہ میں کئی سالوں سے پریشان ہوں تو لوگ سالوں سے مراد بھی مدت نہیں، رشتہ لیتے ہیں۔ ساری زندگی نمبر۲ رہے۔ بھٹو دور میں پی پی کے نمبر۲ لیڈر، این پی پی میں شامل ہوئے تو یہاں بھی دو نمبر لیڈر ہی رہے۔ یہاں تک کہ اپنی بیویوں کے بھی نمبر۲ خاوند رہے۔ قوم کا اس قدر غم ہے کہ ۱۹۹۰ء میں انہیں پتہ چلا کہ پاکستان میں ۴۸ لاکھ لڑکیاں شادی کے انتظار میں بیٹھی ہیں تو انہیں اس وقت تک رات کو نیند نہ آئی جب تک انہوں نے اس تعداد میں ایک کی کمی نہ کر دی۔ سیانے کہتے ہیں کہ مطلقہ کی بجائے بیوہ سے شادی کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے کہ وہ مرد کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے مگر جو مرد اس کے بارے میں جانتا ہوتا ہے، وہ زندہ نہیں ہوتا۔ کھر صاحب کو تجربہ کار لوگ اتنے پسند ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ اس سے شادی کی جسے پہلے شادی کا تجربہ تھا۔ وہ مطلقہ کو ہی اپنے متعلقہ سمجھتے ہیں۔ انہیں تو ڈاکٹر تبدیلی آب و ہوا کا کہے تو سمجھتے ہیں، ڈاکٹر نے تبدیلی آب و حوا کا کہا ہے۔

جی ایم سید فتنوں میں سوچتے اور انچوں میں بولتے ہیں، جبکہ جی ایم غیر سید انچوں میں سوچتے

اور فقتوں میں بولتے ہیں۔ ملک جی ایم غیر سید خود کو پورا ملک سمجھتے ہیں۔ اس لیے اگر وہ کہیں' پورا ملک بھوکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ انہوں نے صبح کا ناشتہ نہیں کیا۔ جہاں تک ملک سے ان کی محبت کی بات ہے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ جو ایک فرانسیسی شاعر نے اپنی محبوبہ سے کہا تھا۔ "میں رات بھر تمہاری جدائی میں جاگتا رہا ہوں اور ساری رات اپنے خوابوں میں صرف اور صرف تمہیں دیکھتا ہوں۔"

ان کا تعلق کھرل قبیلے کی کھر شاخ سے ہے۔ تہمینہ درانی لکھتی ہیں۔ "کھرلوں کا ایک گروہ لاہور سے ملتان جا رہا تھا' راستے میں ملتان کے قریب انہوں نے گنے کے کھیت دیکھے تو انہیں کاٹ کر اپنی جھونپڑیاں بنانے لگے۔ کھیت کے مالک نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟" تو انہوں نے کہا' ہم تو کھرل ہیں۔ کھیت کے مالک نے کہا۔ حرکتوں سے تو تم خر لگتے ہو۔ یوں کھرل کے بعد وہ کھر کہلائے۔" شاید اسی لیے تہمینہ نے جی ایم غیر سید سے شادی کے بعد اپنے نام کے ساتھ بھی کھر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ کھر صاحب بڑے مادہ پرست ہیں۔ یہاں مادہ سے مراد وہی ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔

جب وہ گورنر تھے تو اکثر فور پیس میں ملبوس نظر آتے۔ کسی نے پوچھا۔ "تھری پیس سوٹ تو سنا ہے' فور پیس سے کیا مراد ہے؟" کہا۔ "تھری پیس تو پہنا ہوتا ہے اور ایک پیس ساتھ ہوتا ہے۔" خاتون کے ساتھ تصویر میں جی ایم غیر سید کو پہچاننا بڑا آسان ہوتا ہے۔ جس نے چادر لی ہو' وہ موصوف ہوں گے۔ فرماتے ہیں' پنجاب کی کسی ماں نے مجھ سے بڑا بیٹا نہیں جنا۔ جبکہ میرا دوست "ف" کہتا ہے' یہ کون سی بڑی بات ہے' میں خود دسویں ماہ کی پیدائش ہوں۔ نواب آف کالا باغ نے کہا تھا کہ جس عہدے کے آخر میں نر آئے جیسے گورنر' کمشنر' ڈپٹی کمشنر وغیرہ' ان سے ڈرو۔ جب کھر صاحب گورنر تھے تو لوگ ڈر کر انہیں شیر نہ کہتے بلکہ چھپا گھر کے شیر کو بھی ڈر کے کھر کہہ کر بلاتے۔ یہ شیر آدم خور نہیں بلکہ حوا خور ہے۔ پیر پگاڑا سے کسی نے اس شیر کے بارے میں پوچھا تو وہ بولے۔ "ہم اشرف المخلوقات سے رابطہ رکھتے ہیں' جانوروں سے نہیں۔"

جب گورنر تھے تو ان کی اپنی "ادا" تھی۔ اداکارائیں گورنر ہاؤس میں یوں آتیں جیسے اسٹوڈیو میں آ رہی ہوں۔ یحییٰ خان کے دور میں اداکارہ ترانہ جب یحییٰ خان سے ملنے کے بعد باہر نکلی تو ایوان صدر کے چوکیدار نے انہیں سلیوٹ کیا۔ کسی نے پوچھا' جب وہ آئی تھی تب تو تم نے سلیوٹ نہیں کیا تھا؟ کہا۔ "جب وہ آئی تھی تو صرف ترانہ تھی' جبکہ اب وہ قومی ترانہ ہے۔"

کھر صاحب اگر وزارت عظمیٰ کے امیدوار بھی ہوں تو اس کی وجہ یہی ہو گی کہ اس وزارت میں عظمیٰ بھی ہے۔ ویسے بھی کیا ہوا' اگر وہ وزیراعظم نہ بن سکے' شوہر اعظم تو بن گئے۔ تہمینہ نے جس دن طلاق لی' اس شام انہوں نے کہا' تہمینہ نے میرا گھر برباد کر دیا' عزت کو اخباروں میں اچھالا' الزامات لگائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری آج کی شام برباد کر دی۔ ایک مشہور گلوکارہ کی ذہانت سے متاثر ہو کر اسے شادی کرنے کو کہا۔ وہ واقعی ذہین نکلی' اس نے فورا" کسی اور سے شادی کر لی۔ انہیں انکار اچھا نہیں لگتا۔ ویسے بھی مردوں کو اگر کسی عورت کا "انکار" پسند آئے تو یقین کر لیں وہ پروین شاکر ہو گی۔

اقتدار میں تھے تو اپنا چہرہ سرخ رکھنے کے لیے لسی' مکھن' دودھ اور حنیف رامے کی تصویریں استعمال کرتے۔ کوٹ ادو ان کا وہ کوٹ ہے جسے وہ جس کو چاہیں' پہنا دیں۔ پڑھائی سے اتنا شغف ہے' ان کے سامنے رسالہ کہو تو وہ اسے کتاب کی بجائے فوج کا دستہ سمجھیں گے۔ بحیثیت گورنر انہوں نے ثابت کیا کہ وہ نواب آف کالا باغ لیول کے نواب آف سبز باغ ہیں۔

ان کی زندگی کی کہانی ایک فلمی کہانی ہے' جس میں فائٹیں اور بڑھکیں ہی نہیں گانے بھی موجود ہیں۔ پہلے صرف جاگیر دار تھے تو کہتے میری کوٹھی کے آگے سے گاڑی ہٹاؤ۔ گورنر بنے تو کہنے لگے' میری گاڑی کے آگے سے کوٹھی ہٹاؤ۔ اب کہتے ہیں' کوٹھی کے آگے سے میری گاڑی ہٹاؤ۔ مزاج ایسا کہ اپنے دور اقتدار میں اگر کسی آرٹسٹ

کو فائن کہتے تو ان کے موڈ سے اندازہ لگانا پڑتا کہ کہیں آرٹسٹ سے فائن لینا تو نہیں۔ معاملات ایسے ہیں کہ آپ ان کے ساتھ کاروبار کرنا چاہیں تو پہلے اپنے وکیل سے مشورہ کریں۔ اگر وہ وکیل آپ کو اس کی اجازت دیتا ہے تو پھر آپ کسی اچھے وکیل سے مشورہ کریں۔

دنیا میں جو جھوٹ سب سے زیادہ بولا جاتا ہے' وہ ہے کہ حکومت آپ کے مسئلے حل کرنا چاہتی ہے' لیکن وہ ہر مسئلے کا حل نکال لیتے۔ ان کے دور اقتدار میں کچھ پارٹی ورکرز نے شکایت کی کہ ہمیں جاب نہیں ملتی تو انہوں نے فوراً" ایک کمیٹی بنانے کو کہا جو یہ پتہ چلائے کہ انہیں جاب کیوں نہیں ملتی اور ان کو اس کمیٹی میں جاب دے دی۔ کسی بیوقوف کو اپنا نہیں بناتے' ہاں اپنے کو بیوقوف بنا لیتے ہیں۔ سیاست میں ان کا یہ اصول ہے کہ سیاست میں کوئی اصول نہیں ہوتا۔

گورمانی خاندان کو سیاسی طور پر دفن کرنے کے لیے سیاست میں آئے۔ حالانکہ گور تو اس خاندان کے نام میں پہلے ہی تھا۔ بھٹو اقتدار میں تھے تو یہ ان کے دائیں بائیں ہوتے۔ وہ اقتدار میں نہ رہے تو یہ دائیں بائیں ہو گئے۔ پیپلز پارٹی سے ان کو نکالا گیا' مگر پیپلز پارٹی کو ان سے نہ نکالا جا سکا۔ واپس پی پی میں آئے تو انہیں کچھ نہ کہا گیا یعنی صدر کہا گیا نہ سیکرٹری۔ ۱۹۷۷ء کے بعد ملک چھوڑ دیا۔ اگر یہ ملک نہ چھوڑتے تو ملک انہیں نہ چھوڑتا۔ جان کے گلبرتھ کہتا ہے۔ "سیاست دان اتنا اچھا ہوتا ہے' جتنا برا اس کا حافظہ ہوتا ہے۔" ان کا حافظہ تو ایسا ہے کہ ایک صحافی نے بچوں کی تعداد پوچھ لی تو خود جواب دینے کی بجائے اپنی سیکرٹری کی طرف دیکھنے لگے۔

بے نظیر کے سسر حاکم زرداری فرماتے ہیں' کھر بھٹو کا بریف کیس ہی نہیں ان کے گھر کے جوتے بھی اٹھا کر لے جاتے۔ جس کا مطلب تو یہ ہے کہ بھٹو کا گھر ان کے لیے مسجد تھا۔ انہیں دن اچھا نہیں لگتا کہ صبح صبح چڑھ آتا ہے' البتہ رات پسند ہے کہ یہ اندھیرے میں آتی ہے۔ ناپسندیدہ دن ۲۱ جون کہ اس کی رات بڑی چھوٹی ہوتی ہے۔ سگار پی رہے ہوں تو ساری دنیا ان کے لیے ایش ٹرے ہوتی ہے۔ یہ ہیں

تو مرد آہن مگر آہن کا مسئلہ یہ ہے کہ اسے استعمال نہ کیا جائے تو اسے زنگ لگ جاتا ہے۔ وہ لاکھوں کے مجمع کو کنٹرول کر سکتے ہیں مگر خود کو کنٹرول نہیں کر سکتے۔

ہر کسی کو غلام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو غلام نہ بنے' اسے آقا بنا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں میں کبھی کسی کے آگے نہیں جھکا۔ حالانکہ تہمینہ کہتی ہیں' وہ اپنی بیویوں کے آگے جھکتے۔ ظاہر ہے اتنا لمبا بندہ جھکے بغیر بیوی کے پیٹ میں گھونسا کیسے مار سکتا ہے؟ اچھے ڈرائیور ہیں۔ آج تک جتنے حادثے کئے' سڑک پر نہیں گھر پر کئے۔ گاڑی یوں چلاتے ہیں جیسے گھوڑا دوڑا رہے ہوں۔ اس لیے بریکیں لگاتے وقت اسٹیرنگ یوں کھینچتے ہیں جیسے لگامیں کھینچ رہے ہوں۔ اتنے تیز رفتار کہ جتنی دیر میں آپ ایک پل کراس کرتے ہیں' وہ ڈبل کراس کر چکے ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں' مخالفین مجھ سے اتنا ڈرتے ہیں کہ وہ مجھے زخمی کرنے کے لیے بھی میرے گھر پر تب حملہ کرتے ہیں جب انہیں یقین ہو کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ حریف کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ ویسے بھی حریف سیاست دان اگر آپ سے سارے اختلافات ختم کر کے آپ کے ہاں آئے' تو یقین کر لیں کہ وہ آپ کے جنازے پر آ رہا ہے۔ سائنس کہتی ہے' گرمی سے چیزیں پھیلتی ہیں۔ ان کی گورنری کا دور اتنا گرم تھا کہ ان کی تیس ایکڑ زمین پھیل کر کئی گنا ہو گئی۔ کہتے ہیں مجھ سے اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو آتی ہے۔ اگر یہ خوشبو زیادہ ہو جائے تو کپڑے بدل لیتے ہیں۔

مگر مچھ کی کھال کے جوتے تین تین سال چلاتے ہیں۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے کہ یہ تو کوئی زیادہ عرصہ نہیں' یہ کھال تو مگر مچھ تیس تیس سال چلاتے ہیں۔ کہتے ہیں' میں یاراں کا یار ہوں۔ واقعی وہ زیادہ سے زیادہ "یاراں" کا یار ہو سکتے ہیں' باراں یا تیراں کے نہیں۔ مصیبت میں جو ان کے کام آئے' اسے نہیں بھولتے۔ خاص کر کے اس وقت جب پھر مصیبت میں ہوں۔ فیصلہ کرنے میں اتنی دیر لگاتے ہیں کہ اب ادھیڑ عمر ہونے کا فیصلہ کرنے کی ادھیڑ بن میں ہی ہیں۔ ان کے کاموں کے حساب سے ان

کی عمر کا اندازہ لگائیں تو اپنے بیٹے کے ہم عمر نکلیں گے۔ اداکارہ نینسی آسٹر نے کہا تھا' میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ پچاس سال سے اوپر کی ہرگز نہ ہوں گی۔ سو ایک وقت ایسا آیا' نینسی جو عمر بتاتی' اس حساب سے اس کا بڑا بیٹا چار ماہ بعد پیدا ہوا۔ جی ہاں' نینسی آسٹر کی پیدائش کے چار ماہ بعد۔

عورتیں انہیں ایک شوہر' پی پی ورکرز ایک جوہر' بھٹو صاحب ایک شوفر اور جماعت اسلامی ایک لوفر کے طور پر جانتی ہے۔ انہوں نے اپنا سیاسی سفر کوٹ ادو کے ایک رکن اسمبلی کے طور پر شروع کیا۔ بھٹو کے دست راست بنے۔ پنجاب کے بااختیار گورنر بنے' لیکن پھر وہیں آ گئے جہاں سے انہوں نے یہ سفر شروع کیا تھا۔ یعنی اب وہ پھر صرف کوٹ ادو کے ایک رکن اسمبلی ہیں۔

○○○

• علامہ فی الفور

علامہ فی الفور ان لوگوں میں سے ہیں جو ہر کام جلدی سے کرتے ہیں۔ وہ تو دیر کرنے میں بھی جلدی کرتے ہیں۔ انہوں نے معروف ہونے میں تو چند ماہ ہی لگائے' البتہ غیر معروف ہونے میں کئی سال لگائے ہیں۔ مولانا خواب زادہ علامہ فی الفور بڑی "جھنگ جو" شخصیت ہیں۔ لاہور آ کر لاء کالج کے ہوسٹل میں رہے۔ یہاں لاء ہوسٹل سے مراد سسرال نہیں کہ وہاں بھی مدر ان لاء' فادر ان لاء' سسٹر ان لاء' بلکہ ہر کوئی ان لاء ہی ہوتا ہے۔ وہاں سے نکل کر فیض الحسن صاحب سے "فیض" لیا۔ وہ پیدائشی طور پر بڑے سیاست دان ہیں۔ جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں چھوٹا ادیب' چھوٹا سیاست دان اور چھوٹا اداکار پیدا ہی نہیں ہوتا۔ البتہ وہ پیدائشی طور پر اس لیے بڑے ہیں کہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں۔

مولانا خواب زادہ علامہ فی الفور اس وقت سوتے ہیں جب اٹھنا ہو۔ جبکہ ہم جیسے تب اٹھتے ہیں جب سونا ہو۔ کسی نے ہم سے پوچھا۔ "سو سو کر تھک نہیں جاتے؟" تو ہم نے کہا۔ "جب تھک جاتے ہیں تو پھر سو جاتے ہیں۔" یہ پتہ کرنا کہ علامہ صاحب سوئے ہوئے ہیں یا نہیں' بڑا آسان ہے۔ آپ کو ان کے پاس بیٹھے پانچ منٹ ہو جائیں اور وہ نہ بولیں تو سمجھ لیں' وہ سوئے ہوئے ہیں۔ لوگ تو جاگتے میں کام کرتے ہیں' یہ سوئے ہوئے بھی فارغ نہیں ہوتے۔ خواب ملاحظہ فرما رہے ہوتے ہیں۔ خوابوں کا سلسلہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ گوربا چوف نے ایک بار کسی کو بتایا کہ مجھے بڑی پریشانی ہے۔ رئیسہ گوربا چوف روز سوتے میں یہ خواب دیکھتی ہیں کہ اس کی کسی امریکی سے شادی ہو رہی ہے۔ تو سننے والے نے کہا۔ "اس وقت تک پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' جب تک وہ یہ خواب جاگتے میں نہیں دیکھنے لگتیں۔" علامہ صاحب جاگتے میں خواب دیکھتے ہی نہیں' دکھاتے بھی ہیں۔ فرماتے ہیں' ان کا نام بھی خواب میں رکھا گیا۔ یہی نہیں

انہوں نے تو نام پیدا بھی خواب ہی سے کیا۔
اپنے ہر کام کو الہامی سمجھتے ہیں۔ کچھ کام تو واقعی لگتے بھی ہیں یعنی ان کا تعلق انسانی عقل سے نہیں لگتا۔ علامہ صاحب دنیا کے واحد فرد ہیں جنہیں کوئی درازی عمر کی دعا بھی نہیں دے سکتا۔ کیونکہ بقول علامہ فی الفور بحوالہ خواب نمبر ------ اللہ تعالیٰ نے میری عمر 63 سال مقرر کی جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑھا کر 66 برس کر دی۔ لیکن میں نے قبول نہ کی اور عرض کیا کہ 63 برس سے زیادہ زندہ رہنا نہیں چاہتا کیونکہ اس طرح عمر کے سلسلے میں سنت نبوی کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوں گا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مان کر 63 کر دی۔ ویسے علامہ صاحب نے اس عمر کی حفاظت کے لیے اتنے گارڈز رکھے ہیں کہ لگتا ہے وہ انہیں لوگوں سے نہیں بچا رہے' بلکہ لوگوں کو ان سے بچا رہے ہیں۔ ہمارے ایک صحافی دوست بتاتے ہیں کہ علامہ کی دعا بڑی جلدی قبول ہوتی ہے۔ میں ملنے گیا۔ مدعا بیان کیا تو انہوں نے کہا۔ "جاؤ ------ کھوئی ہوئی رقم مل جائے گی۔" اور ان کی آدھی دعا فوراً" قبول ہو گئی کہ میں وہاں سے چلا آیا۔
علامہ صاحب تقریر کر رہے ہوں تو وہ جنہیں اردو بھی نہیں آتی' سمجھ ان کو بھی آ رہی ہوتی ہے۔ بلکہ وہ نہ بھی بول رہے ہیں تب بھی سننے والوں کو سمجھ آ رہی ہوتی ہے۔ دوران گفتگو ہم نے آج تک کسی کو ان سے اختلاف کرتے نہیں دیکھا' جس کی واحد وجہ یہ ہے کہ دوران گفتگو وہ کسی اور کو بولنے کا موقع نہیں دیتے۔ ویسے علامہ صاحب جس تیزی سے بولتے ہیں' اس تیزی سے تو ہم سن بھی نہیں سکتے۔ بہت لمبی تقریر کرتے ہیں کیونکہ مختصر تقریر سننے کے لیے آج کل لوگوں کے پاس وقت ہی کہاں ہوتا ہے۔ ٹی وی کے مذہبی پروگراموں کی کاسٹ میں شامل رہے۔ ایسے مقرر کہ جو انہیں ایک بار سن لے' پھر انہیں مقرر نہیں کہتا' مکرر کہتا ہے۔ ایک بار ٹی وی پر ان کی تقریر نشر ہونا تھی۔ دو تین بار اس کا ٹیلپ چلا۔ اس پروگرام کے پروڈیوسر کو اس تقریر کی تعریف میں اتنے خط ملے کہ وہ پریشان ہو گیا۔ ہم نے پریشانی کی وجہ

پوچھی تو کہنے لگا۔ "سوچتا ہوں عین وقت پر بوجوہ علامہ صاحب کی تقریر ٹیلی کاسٹ نہ کی جا سکی تو اتنے خط آئے۔ اگر تقریر ٹیلی کاسٹ ہو جاتی تو پھر کتنے آتے؟"

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ "انسان زبان کی اوٹ میں چھپ سکتا ہے۔" مگر علامہ صاحب نے زبان خود کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی۔ میرے دوست "ف" کے بقول بندہ خواب زادہ طاہر القادری صاحب کا انٹرویو کرنے جائے تو واپس آ کر اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ تو ڈکٹیشن لے کر آیا ہے۔ وہ اکیلے چار آدمیوں جتنا کام کرتے ہیں۔ آپ ان کو کھانا کھاتے دیکھ لیں تو اس کا یقین بھی آ جائے گا۔ کمزوری محسوس ہو تو گوشت کی کڑاہی منگا لیں گے اور ایک منٹ میں ختم ہو جائے گی۔ آپ سوچتے ہوں گے کمزوری' جی نہیں' کڑاہی۔

وہ دوسروں کے ہاتھوں استعمال نہیں ہوتے' خود اپنے ہاتھوں استعمال ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں مجھے اقتدار پسند نہیں۔ ویسے ان کے طریقہ کار سے واقعی یہی لگتا ہے کہ وہ کبھی اقتدار حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ البتہ ڈاکٹر اسرار احمد کہیں کہ مجھے اقتدار پسند نہیں تو بندہ سمجھتا ہے' اپنے بھائی اقتدار احمد کی بات کر رہے ہیں۔ جبکہ علامہ صاحب تو اسی کی خاطر سیاست برد ہوئے۔ پاکستان عوامی تحریک کی بنیاد رکھی جس میں تحریک تو ہے مگر عوام نہیں۔ ۱۹۹۰ء کے ضمنی انتخابات میں ایک امیدوار عوامی تحریک کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش میں تھا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا۔ "میرے حساب سے مجھے الیکشن جیتنے کے لیے نو دس ووٹ اور چاہئیں۔" علامہ صاحب کہتے ہیں میرے پاس جو ہو' وہ تقسیم کر دیتا ہوں۔ واقعی ان کے پاس جو ووٹ تھے' انہوں نے وہ تقسیم کر دیئے۔

ان کی تحریک کا نعرہ ہے۔ "جوانیاں لٹائیں گے' انقلاب لائیں گے" مگر کہتے یوں ہیں "جوانیاں لوٹائیں گے' انقلاب لائیں گے" جو اچھا بھلا کسی حکیم کا اشتہار لگتا ہے۔ علامہ صاحب پارٹی کے لیے یتیموں اور بیواؤں سے چندہ نہیں لیتے۔ اس لیے جو انہیں چندہ نہ دے' اسے بیوہ اور یتیم سمجھتے ہیں۔

سیلف میڈ ہیں' یہاں تک کہ علامہ اور پروفیسر بھی سیلف میڈ ہیں۔ ڈاکٹر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو علاج کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو خود قابل علاج ہوتے ہیں۔ مولانا خواب زادہ علامہ فی الفور صاحب کے والد صاحب انہیں علاج کرنے والا ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں' مگر موصوف کو میڈیکل کالج میں داخلہ نہ مل سکا۔

مولانا وہ مرد ہیں جنہوں نے زنانہ وار لکھا۔ وہ جتنی کتابوں کے خود کو مصنف بتاتے ہیں' صرف ان کی فہرست مرتب کی جائے تو ایک کتاب بن جائے۔ وہ دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے لکھتے ہیں۔ کسی نے پوچھا۔ "آپ اتنا لکھنے کے بعد کیا محسوس کرتے ہیں؟" تو میرے دوست "ف" نے کہا۔ "اتنا لکھنے کے بعد تو بندہ محسوس کر ہی نہیں سکتا۔" فرماتے ہیں' مولانا مودودی کی جتنی تحریریں میں نے پڑھی ہیں' اتنی مولانا مودودی نے خود اپنی تحریریں نہ پڑھی ہوں گی۔ علامہ صاحب کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کر سکتے ہیں۔ انہوں نے یہ مقام اپنی ذاتی کوششوں سے حاصل کیا' جیسے ہمارا دوست "ف" اپنی ذاتی کوششوں سے اس مقام پر ہے کہ وہ اپنے سات بھائیوں میں اکیلا سید ہے۔ علامہ صاحب خود اس فرقے سے ہیں جو فرقہ بندی کے خلاف ہے۔ انہوں نے زندگی میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا۔ اگر کیا ہے تو وہ اپنا نہ ہو گا۔ ہر کام ترتیب سے کرتے ہیں۔ وہ تو بے ترتیبی بھی ترتیب سے کرتے ہیں۔

اگر وہ کہیں کہ مجھے خوبصورت چہرہ دیکھے دیر ہو گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ انہیں شیشہ دیکھے گھنٹہ ہو گیا ہے۔ ان کی شخصیت میں انفرادیت ہے۔ یہی انفرادیت انہیں اجتماعیت نہیں لانے دیتی۔

ooo

• مریضِ الملت مہاجر حسین

ایک زمانہ تھا جب مہاجر حسین امریکہ میں سیاسی پناہ لینا چاہتے تھے مگر انہیں الطاف حسین کے علاوہ کوئی سیاست دان نہ جانتا تھا۔ پھر وہ اتنے مشہور ہوئے کہ کراچی اور حیدر آباد کی ہر گلی میں ان کی تصویر تھی۔ سیاست دان ان کے گھر یوں حاضری دیتے کہ لگتا اب بھی الطاف حسین کے علاوہ انہیں کوئی نہیں جانتا۔ آج کل وہ لندن میں ہیں جہاں کام اور زکام ہی ہوتا ہے' مگر اب لگتا ہے الطاف حسین بھی انہیں نہیں جانتا۔ وہ جتنی دیر ہسپتال میں رہے' اتنی دیر تو اپنے گھر میں نہ رہے ہوں گے۔ صرف اس وقت ہسپتال سے باہر آتے' جب دوسرے ہسپتال جانا ہوتا۔ گھر کو بھی ہسپتال کی طرح اتنا صاف رکھتے کہ لوگ نہ صرف ان کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے پاؤں صاف کرتے بلکہ کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے بھی کرتے۔ ان کے حمایتیوں کی طرح مخالفوں کا بھی زیادہ وقت ہسپتالوں میں ہی کٹتا۔ یوں سیاست میں وہ الطاف بھائی کی بجائے ہسپتال بھائی کے طور پر ابھرے۔ لوگ انہیں دوست نہیں بھائی کہتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دوست تو بندہ مرضی سے بناتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں بٹوارہ ہوا تو جو خانساماں تھا اس کا "خان" ادھر آ گیا اور "ساماں" ادھر رہ گیا۔ برتن یوں بٹے کہ "بر" ادھر اور "تن" ادھر۔ سردار جی کے تو "ٹرانسسٹر" کا یوں بٹوارہ ہوا کہ ان کے پاس "ٹرانس" ہی بچی' "سسٹر" پیچھے رہ گئی۔ مہاجر حسین نے کراچی اور حیدر آباد میں جو مہاجر تھے' انہیں ایم کیو ایم کا رکن بنایا' جو نہیں تھے انہیں مہاجر بنایا۔ مہاجر حسین خود آگرہ میں پیدا ہوئے اور وہاں سے کراچی آ گرے۔ ان کے دل میں مہاجروں کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے' جو اسلامی جمعیت طلبہ اور پولیس نے کوٹ کوٹ کر بھری۔ ان کی سیاسی عمر اتنی ہی ہے جتنی ان کی اپنی عمر ہے۔ انہوں نے اپنی لائف سٹوری میں مرکزی کردار ادا کیا۔ ایم کیو ایم کی ہسٹری مہاجر حسین کی

لائف ہسٹری ہی ہے۔ انہیں جہاں پناہ ملی' جہاں پناہ بن گئے۔

بچپن میں پسندیدہ کھیل لڑائی تھا۔ ان کی والدہ جب انہیں خوش کرنا چاہتیں تو کوئی لطیفہ نہ سناتیں' بس یہ بتاتیں کہ ساتھ والی گلی میں لڑائی ہو رہی ہے اور وہ خوش ہو جاتے۔

بچپن میں وہ کھلونے پسند تھے جن میں فوجی ہوں۔ پاکستانی فوجی کھلونے اس لیے پسند تھے کہ بادشاہ اور وزیر کے کھیل میں بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ امریکی فوجی کھلونے اس لیے کہ ان کے تو ڈبوں میں بھی ائیر کنڈیشن لگانا پڑتا ہے جبکہ چینی فوجی کھلونے وہ ہیں جنہیں کبھی ڈبوں سے باہر ہی نہیں نکالا جاتا۔ نوجوانی میں بری طرح فوج میں جانے کا شوق تھا' سو بری طرح گئے اور آئے۔

جامعہ کراچی میں بھی فارمیسی میں تھے تو اس کا ریکارڈ توڑنے کی کئی کوششیں کیں۔ مگر پولیس نے ریکارڈ ٹوٹنے سے بچا لیا۔ ان دنوں ان کے پاس سر ڈھانپنے کے لیے ایک ٹوپی اور پہننے کے لیے ایک عینک ہوتی تھی۔ چلنے کے لیے ففٹی موٹر سائیکل جو ففٹی موٹر تھی اور ففٹی سائیکل' یعنی سواریاں اس پر موٹر کی بیٹھتیں اور وہ چلتی سائیکل کی طرح۔ وہ پٹرول سے نہیں' امید سے چلتی اور چلتے ہوئے ایسے ہی لگتی جیسے واقعی امید سے ہو۔ نقل و "حمل" کی وجہ سے اس کا یہ حال ہو گیا تھا کہ لوگ یہ نہ پوچھتے یہ کس کی ہے' یہ پوچھتے کہ یہ کیا ہے؟ وہ ان کی زبان سمجھتی۔ اس لیے وہ بریک کا کام بھی زبان سے لیتے۔ یعنی کوئی سامنے آ جاتا تو بریک کی بجائے اپنی زبان کو استعمال کرتے۔ یوں گاڑیوں کے نیچے آتے آتے وہ وقت آیا کہ ان کے نیچے گاڑیاں آنے لگیں۔

ابتدا میں تو مالی حالت ایسی تھی کہ کوئی مصیبت بھی مول نہ لے سکتے' وہ بھی ادھار ہی لینا پڑتی۔ روزانہ شام کو جن سے قرض لینا پڑتا' ان کی میرٹ لسٹ بناتے اور جس کا ادھار سب سے زیادہ ہوتا' اس سے مزید ادھار لینا بند کر دیتے تاوقتیکہ کسی اور کا ادھار اس سے زیادہ نہ ہو جاتا۔ پھر وہ ایسے امیر ہوئے کہ ایسا کسی جماعت کا امیر نہ ہوا۔

وہ پہلے الطاف حسین تھے' پھر مہاجر اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن بنے اور پھر ایم کیو ایم کہلائے۔

۱۹۸۶ء میں ایم کیو ایم کے جلسے میں بادل اور بے دل مہاجر حسین برسے اور پاکستانی سیاست میں سیلاب آ گیا۔ اس کے لیے وہ جیلوں میں مچھر اوڑھ کر سوئے۔ مہاجر حسین کی اسی کسرت نے ایم کیو ایم کو کثرت دی۔ کہتے ہیں ایم کیو ایم کو چلانا بڑے دل گردے کا کام ہے اور ڈاکٹروں نے ثابت کیا کہ واقعی ان کا گردہ بڑھا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے بیس سال کی عمر میں بھی بیسیوں کے تھے۔
رنگ ایسا کہ میلا کپڑا بھی پہن لیں تو کپڑا اجلا لگنے لگے۔ پاجامہ پسند ہے۔ وجہ یہ بتاتے ہیں کہ پاجامہ پہنا ہوتا ہے اور شلوار پہنی جاتی ہے۔ یوں وہ پاجامے میں پھولے نہیں سماتے۔ عینک چہرے کا لباس ہے۔ اس لیے عینک کے بغیر محفلوں میں نہیں جاتے۔ شاید اسی لیے بزرگ عینکوں کو پہننے کے لیے پیچھے رسی آزار بند کی طرح باندھے ہوتے ہیں۔
جذبات اور جزیات کے سمندر ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب یہ جاننے کے لیے کہ کراچی کا موسم گرم ہے یا سرد' لوگ محکمہ موسمیات کی بجائے مہاجر حسین کے بیان دیکھتے' کیونکہ وہاں سردی اور گرمی کا موسم ایسا ہوتا ہے کہ منٹ میں سردی گرمی ہو جاتی ہے۔
ویسے برے موسم کا اور کوئی فائدہ ہو نہ ہو' یہ ہے کہ جہاں موسم اچھا ہو وہاں لوگوں کو آپس میں لڑنے کے لیے مذہبی تفرقہ بندیوں کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ مہاجر حسین چپ ہوں تو دوست پریشان ہو جاتے ہیں اور ڈاکٹر کو بلانے کا سوچنے لگتے ہیں۔ زبان چل رہی ہو تو سمجھ لیں' ان کی سانس چل رہی ہے۔ زبان بند ہے تو ڈاکٹر زبان نہیں' نبض دیکھتے ہیں۔ جہاں بولنے کا موقع نہ ملے' وہاں بھی چپ نہیں ہوتے۔ سارا دن بول بول کر اس قدر تھک جاتے ہیں کہ بمشکل اپنا منہ بند کرتے ہیں۔ ان کا جو آپریشن ڈاکٹر ایک گھنٹے میں کر لیتے' اس کی تفصیل بتانے میں مہاجر حسین ایک ماہ لگا دیتے ہیں۔
ٹیلیفون پر تقریریں کر کر کے یہ حال ہو گیا کہ بھائی کو بھی فون کریں تو ہیلو یوں کہیں گے۔ "عزیز ساتھیو' بزرگو' میری تحریکی ماؤں اور بہنو' ہیلو!" عزیز آباد جو اب انہیں عزیز ہے نہ آباد' وہاں ان کے گھر ۱۵ ٹیلیفون تھے۔ کسی نے پوچھا۔ "یہاں پندرہ فون کیوں ہیں؟" کہا۔ "اس لیے کہ اس سے زیادہ کی جگہ نہیں تھی۔" پہلی بار آنے والے غیر

ملکیوں کو بتانا پڑتا ہے کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ٹیلیفون ٹھیک کر کے روزی کماتے ہیں' یہ ٹھیک نہ کر کے بھی کما لیتے ہیں۔"

ان کا پسندیدہ دوست الطاف حسین ہے۔ "ایسے" دوست کی صحبت میں رہ کر یہ بھی "ویسے" ہو گئے ہیں۔ شیشہ دیکھتے ہوئے بھی یہ سمجھتے ہیں وہ شیشہ نہیں دیکھ رہے' شیشہ انہیں دیکھ رہا ہے۔ ان دنوں بندہ کراچی میں کسی سے ان کے پتے کا پوچھتا تو مہاجر "کروٹن" کے پتے کا بتاتے۔

جاگیرداروں نے سیاست کو اتنا مہنگا کر دیا ہے کہ الیکشن ہارنے کے لیے بھی لاکھوں روپے چاہئیں' لیکن انہوں نے سیاست کو سستا کر دیا۔ وہ اس پر یقین رکھتے جو ایک مارے' وہ قاتل۔ جو بہت سوں کا مارے' وہ فاتح اور جو سب کو مارے' وہ خدا ہوتا ہے۔ انہیں کوئی کام کرنے کا غلط طریقہ بتاتا تو کہتے' مجھے وہ طریقہ بتاؤ جو مجھے پہلے معلوم نہ ہو۔

کہتے ہیں تعلیمی ادارے ان دنوں تعلیم و تربت کا مرکز بن گئے۔ رشتوں کا یہ عالم ہوا کہ جسے سب برا اور ناقابل اصلاح سمجھتے' اسے دادا کہہ کر بلاتے۔ مہاجر حسین خود کو سیلف میڈ کہتے ہیں جبکہ لوگ انہیں میڈ ان مارشل لاء لکھتے ہیں۔ کچھ غوث علی شاہ کو پیر مہاجر حسین کا غوث اعظم سمجھتے ہیں۔ ویسے وہ سیلف میڈ نہیں لگتے کہ اگر انہوں نے خود کو آپ بنایا ہوتا تو ایسا بنایا ہوتا؟

ڈاکٹر کے لیے تو دنیا میں دو قسم کے لوگ ہی ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بیمار ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جنھوں نے بیمار ہونا ہوتا ہے۔ یوں بھی بیمار ہونا ڈاکٹروں کی مالی امداد کرنا ہی ہے۔ سو مریض الملت مہاجر حسین کے کسی اور پر احسانات ہوں نہ ہوں' ڈاکٹروں پر ضرور ہیں۔ بچپن میں وہ ڈاکٹر بن کر مریضوں کے کام آنا چاہتے تھے۔ یہ تو نہ کر سکے مگر مریض بن کر ڈاکٹروں کے کام آئے۔ صحت کی انہیں اتنی فکر رہتی ہے کہ کسی کو صحت مند دیکھ لیتے تو انہیں فکر ہونے لگتی۔ بچپن میں وہ محلے کی کلب میں لوہے کے باٹ اٹھایا کرتے اور ایک بار باٹ اٹھاتے پکڑے بھی گئے۔ فروری کے مہینے

میں سب سے کم دن بیمار رہتے' جس کی وجہ یہ ہوتی کہ فروری میں سب سے کم دن ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں' ہم نے مہاجر نوجوانوں کے لیے Health کلب بنائے جو بعد میں Hellth کلب نکلے۔ جہاں ڈرل کے لیے ڈرل ماسٹر نہیں ڈرل مشینیں تھیں۔ مہاجر حسین کا مخالفوں سے جو برتاؤ ہوتا ہے' اس میں بر کم اور تاؤ زیادہ ہوتا ہے۔

وہ ہر کام یقین سے کرتے ہیں۔ وہ تو شک تک یقین سے کرتے ہیں۔ ہمارا اردو زبان پر یہی احسان ہے کہ ہم پنجابی بولتے ہیں' لیکن انہوں نے اردو کو نئے نئے محاورے دیئے۔ ان میں یہ نامعقولہ بھی ہے کہ زن' زر' زمین اور زبان فساد کی جڑ ہے۔ یوں جو پہلے مہاجر حسین کو عمر دراز ہونے کی دعا دیتے' پھر یہی دعا زبان کے لیے دینے لگے۔ انہوں نے کراچی کو ریاست بنایا مگر اسے سمجھا خالصہ ریاست۔ ان دنوں کراچی کی سڑکوں پر مہاجر حسین کی اتنی بڑی بڑی تصویریں ہوتیں کہ دو جاپانی تو اپنے ملک کے فلمی رسالے کے لیے ان کا انٹرویو کرنے پہنچ گئے۔ ان کی بامثال کامیابی کی وجہ ان کا یہ اصول تھا کہ سیاست میں اصولوں پر سودا بازی نہیں ہونا چاہیے' اس کے بغیر ہونا چاہیے۔

اب ان کے پاس خدا اور خلق کا دیا سب کچھ ہے۔ صفائی اس قدر پسند کہ ان کا حکم ہے' ہر کام صفائی سے کرو۔ پریس کو انہوں نے جتنا پریس کیا' آج تک کوئی نہ کر سکا۔ کہتے ہیں میری شادی ایم کیو ایم سے ہوئی ہے۔ ان کے ایم کیو ایم کے ساتھ سلوک سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔

وہ پاکستان کے پہلے سیاست دان ہیں جنھوں نے باقاعدہ سیاست سے ریٹائرمنٹ کا اعلان بھی کیا۔ ہمارے ایک مشہور نقاد نے کہا۔ "میں فلاں اعلیٰ افسر پر ایسا مضمون لکھ رہا تھا کہ وہ فیض اور ندیم کے پائے کے شاعر بن جاتے مگر ------" ہم نے پوچھا۔ "مگر کیا اس نے شاعری چھوڑ دی؟" کہا۔ "نہیں' وہ ریٹائر ہو گئے۔" یہی حال ان کے ریٹائرمنٹ کے اعلان کے بعد ہوا۔ اگرچہ سیاست میں ریٹائرمنٹ کا اعلان بھی سیاست کرنا ہی ہے۔ سیاست دان تو کہے کہ میں مر چکا ہوں' تب بھی سمجھیں اپنی قیمت بڑھا رہا ہے کہ ہاتھی سفید ہی کیوں نہ ہو' زندہ لاکھ کا اور مردہ سوا لاکھ کا۔ کچھ تو سیاست میں زندہ

ہی اسی صورت رہ سکتے ہیں کہ وہ مر جائیں۔ تاہم مہاجر حسین یہ بھی کہیں کہ میں مر گیا تو سننے والا یہی پوچھے گا۔ "کس پر؟" وہ جب ہسپتال میں ہوتے تو صرف ایک آدھ بندے کو پتہ ہوتا کہ وہ کس بیماری کے ساتھ داخل ہیں کیونکہ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے "بیماری" کو ساتھ والے کمرے میں بھیج دیا جاتا۔ ویسے بھی ہسپتال میں تبدیلی دل کے آپریشن ہوتے رہتے ہیں' لیکن بندہ کسی پارک میں تبدیلی دل کرتا پکڑا جائے تو کوڑے پڑ جائیں۔ بہرحال ہم تو مہاجر حسین کے بارے میں جاننے کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ دولت' عزت' صورت اور سیرت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔